سیف و سبو

جوش

مکتبہ اردو لاہور

پھر جمع کر رہا ہوں دلِ لخت لخت کو

سیف و سبو

جوشؔ ملیح آبادی

مکتبہ اُردو لاہور

قیمت پانچ روپے

تعداد اشاعت گیارہ سو

مرکنٹائل پریس لاہور میں چوہدری نذیر احمد پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر مکتبہ اردو لاہور سے شائع کیا

اے رُوحِ عصرِ حاضرِ ہندوستانِ نو — لایا ہے اِک صحیفۂ سخنداں ترے لئے
اِس مصحفِ عظیم کی اللہ ری وسعتیں — ہر سطر ہے مشرقین بداماں ترے لئے
ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے — چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عنواں ترے لئے
رُکتی ہے جس مقام پہ رُوح الامیں کی سانس — دِل کو وہاں کیا ہے پر افشاں ترے لئے
لایا ہُوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے — یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے
کِتنی شبوں کے طاق میں رکھ کر چراغِ دل — پرکھی ہے رُوحِ عالمِ امکاں ترے لئے
اِس کی خبر بھی ہے کہ بنایا گیا ہے لحن — کِتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ترے لئے
ڈھالے ہیں مرغزار و گلستاں کی شکل میں — کِتنے مہیب و تیرہ بیاباں ترے لئے
گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں، خبر بھی ہے — کِن مہوشوں کی زُلفِ پریشاں ترے لئے

کس کو خبر تراش کے کن ظلمتوں کا دل
لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے

میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل
کس شوخ کا تبسمِ پنہاں ترے لئے

واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صرف
کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لئے

لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں کیا کہوں
کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے

تعبیر کی ترازوئے نرم و نہفتہ میں
تولے ہیں کتنے خواب پریشاں ترے لئے

کیا پوچھتا ہے جوشؔ کی بربادیوں کا حال
پُرزے ہے کب سے جیب و گریباں ترے لئے

فہرس

انتقاد و انتخاب، ۷

آتش کدہ، ۱۷

افکار، ۵۳

رنگ و بُو، ۷۹

مطالعۂ نظر، ۱۰۷

تاثرات، ۱۳۹

نگارخانہ، ۱۶۵

وارداتیں، ۱۸۵

بادۂ سرجوش، ۲۱۱

رُباعیات، ۲۴۷

در ہیچ مقامم نہ گزارد بہ دِرنگے !
از بُوئے بہ بُوئے بَرد از رنگ بہ رنگے !

اِنتقاد و اِنتخاب

انتقاد و انتخاب تقریباً ناممکن چیز ہے۔ اِس راہ میں اِتنے زبردست پیچ و خم ہیں کہ منزل تو ملتی نہیں، البتہ راہ رو خود گم ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر اُس گم شدگی کے عالم میں، جہاں کہیں ٹھنڈی چھاؤں ملتی ہے، اُسی کو منزل فرض کر کے، وہیں ٹھہر جاتا ہے۔

انتقاد کی موٹی موٹی تین قسمیں ہیں:

(۱) تخیُلی انتقاد۔ (جو آجکل عام ہے)

(۲) تخریبی اِنتقاد

(۳) تحقیقی انتقاد

اب ان پر باری باری نگاہ ڈالیے۔

(۱) **تخیُلی اِنتقاد**۔ یہ آج کل کا وہ مروج طرزِ نقد ہے جسمیں ناقد، ادیب و شاعر سے تقریباً بے نیاز ہو کر صرف اپنی جانب متوجہ رہتا ہے، آیئنے میں اپنے خال و خد دیکھتا ہے اور اپنے ہی چہرے کے عکس میں شاعر کے چشم و ابرو کو پیش کرتا ہے۔

اِس طرز میں ناقد اپنے ذوقِ ادب کے انتشار، اپنے ذہن کی تخلیقی قوّت کے اعلان، اور اپنے نفسیات کے اظہار میں اس درجہ محو و مستغرق ہو جاتا ہے کہ حقیقی انتقاد کا سر رشتہ ہاتھ سے

چھوٹ جاتا ہے۔

ہرچند اس روش میں ایک انوکھاپن، ایک اُپج، ایک ادبی تراش خراش، ایک شاعرانہ آن بان، اور نفسیاتی تحلیل کی دلچسپی و افادیت تو ضرور پائی جاتی ہے، لیکن اس میں ادیب و شاعر پنہاں، ناقد پیدا۔ دریا نہاں، سراب عیاں۔ حقیقت کم، اور افسانہ زیادہ پایا جاتا ہے۔

(۲) تخریبی انتقاد ۔ یہ محض ادبی حاسدوں کا میدان ہے، اور کچھ نہیں۔ اِس طرز کو صرف وہی افراد پسند و اختیار کرتے ہیں جو احساسِ کمتری کی بیماری میں گرفتار ہوتے ہیں اور جنہیں قلق کے ساتھ اس کا احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے اُنہیں قوائے تخلیقی سے یکسر محروم رکھا ہے۔ اور جب وہ اربابِ تخلیق کی سرفرازیوں کو دیکھتے ہیں تو اُن کے دل سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے، اور وہ اُس دھوئیں کی سیاہی سے اربابِ تخلیق کا مُنہ کالا کرنے کی ناکام سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اِس کے علاوہ اِس میدان میں وہ افراد بھی کرتب دکھانے اُترا کرتے ہیں جو زندگی کے کسی موڑ، یا خیالات و عقائد کے تصادم و اختلاف کی بنا پر کسی ادیب یا شاعر سے بگڑ جاتے ہیں، اور اظہارِ غیظ و غضب کا سب سے آسان طریقہ اُنہیں یہی نظر آتا ہے کہ وہ اُس ادیب یا شاعر کا مُنہ چڑانے لگیں، اُس کے خلاف محفلوں اور رسالوں میں پراپگنڈا کریں، اُس کے آرٹ کو توڑ مروڑ کر پیش کریں، ادب کے صحیح مُسلّمات کو غلط طور سے استعمال کر کے اُس میں عیوب نکالیں اور یہ ثابت کریں کہ اُسکے ادب و شعر میں نہ تو عُمق ہے، نہ پاکیزگی، وہ مغرب زدہ ہے، ادبِ کثیف پیش کرتا ہے اور مُلک کے نوجوانوں کو "خدا" اور "مذہب" کا باغی بنا رہا ہے۔ (یہ جُملے اور الفاظ میں نے اسلئے تحریر کئے ہیں کہ اس قبیل کے حضرات آجکل انہیں الفاظ سے کھیلتے اور معنی و مفہوم سمجھے بغیر لکھا اور رٹا کرتے ہیں)

(۳) تحقیقی انتقاد ۔ یہ راہ مُتذکرہ بالا دونوں راہوں سے قطعی مختلف بھی ہے اور شدّت کے ساتھ صعوبت انگیز بھی۔ سب سے پہلی اور شاید لاعلاج دُشواری اس سلسلے میں یہ ہے کہ:

(الف) ناقد، یا تو منقود کو پہلے سے پسند کرتا ہوگا یا ناپسند۔ (جس کے بے شمار معلوم و نامعلوم اسباب ہو سکتے ہیں)۔

(ب) یا ناقد اگر اُس کا ہم عصر و شناسا ہے تو اُسے منقود سے محبّت و موانست ہوگی، یا نفرت و کدُورت، یا کم سے کم اجتناب و وحشت اور اِن دونوں اور اِن کے حمائل تمام دیگر حالات میں بے لاگ انتقاد کا پیدا ہونا امکان سے خارج ہے۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسری دُشواری بھی، جو پہلی دُشواری کی طرح اغلباً ناقابلِ حل ہے یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کا کلام و کردار، ناقد کے عقائد و روایات کے خلاف واقع ہوُا ہے، تو بظاہر انتہا درجے کا بے تعصُب ناقد بھی شاعر کے ساتھ انصاف برتنے سے قطعی طور پر قاصر رہ جائیگا۔

اِن متذکّرہ بالا دونوں قباحتوں کے بعد اب حقیقی انتقاد کی شرطیں مُلاحظہ فرمائی جائیں۔ سب سے پہلی اور سب سے زیادہ اہم شرط یہ ہے کہ :

ناقد، شاعر کی رُوح کو اپنے میں جذب کرلے (اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ناقد فطرتاً شاعر کا ہم خیال، ہم رنگ، اور ہم مذاق نہ ہو) اور ظاہر ہے کہ یہ صُورت اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ناقد :

(الف) شاعر کے ماضیٔ و حال اور مستقبل کے میلان۔ شاعر کے کلّیات و نظریّات۔ عقائد و اصُول۔ اقارب و احباب۔ تعلیم و تربیت۔ محاسن و معائب۔ مزاج و ماحول۔ موروُثی خصُوصیات اور جغرافیائی اثرات سے کماحقّہٗ واقفیت پیدا کرلے۔ اور یہاں تک کہ خلوت و جلوت کی مُسلسل و بے محابا ہم نشینی کی معرفت شاعر کے مرغوُبات و معمُولات تک پر کامل طور سے حاوی ہو جائے۔

(ب) شاعر کے زمانے کی خصوُصیتوں، تقاضوں اور ادبی معاشرتی اور سیاسی تحریکوں کو بخوبی ذہن نشین کرلے۔

(ج) تقریباً اُن تمام تخیلی و عملی راستوں سے خود بھی گزرے جن سے شاعر گزرا یا گزر رہا ہے
(د) اور ہر نظم کے باب میں اُسے براہِ راست، یا کم سے کم، معتبر ترین وساطت سے یہ معلوم ہو کہ اُس کا پسِ منظر کیا تھا۔ اور وہ جذبے کے تموّج میں کہی گئی تھی یا تمکین میں۔
اِن شرطوں میں سے اگر ایک شرط بھی رہ جائیگی، ناقد، حقِ انتقاد سے عہدہ برآ نہیں ہو سکیگا۔ اور اُس کا تمام تحریری عمل ناقص، ناتمام، پیچیدہ، غلط، مُبہم اور گمراہ کُن ہو کر رہ جائیگا۔
یہاں تک تو ذکر تھا انتقاد کا، اب انتخاب کی طرف آیئے۔ سو یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اِس راہ میں بھی ایسے ایسے ہفت خواں ہیں، جن کا طے کرنا معمولی دِل گُردے کا کام نہیں ہے۔
انتقاد کے باب میں جن دُشواریوں اور شرطوں کا ابھی ذکر ہوا ہے، تقریباً اُن سب کو انتخاب میں بھی شامل کرنے کے بعد انتخاب کی مخصوص دُشواریاں ملاحظہ فرمایئے۔ فرض کیجئے کہ انتخاب کے وقت:
(۱) انتخاب کرنے والے کا مُوڈ خراب، یا مزاج ناساز ہے۔
(۲) اُس پر کوئی خاص جذبہ طاری ہے۔
(۳) رات یا دوپہر کی غذا یا موسم کی شدّت ذہن پر بُرا اثر ڈال رہی ہے۔
(۴) یا دفعتہً کسی کرخت، غمگین یا میٹھی آواز نے اُس کے نظامِ اعصاب و عملِ ذہن میں یکایک اختلال پیدا کر دیا ہے۔ تو ان تمام حالتوں، اور اِن کے مماثل تمام دیگر حالات میں صحیح انتخاب ناممکن ہو کر رہ جائے گا۔

اب دُوسروں سے رُوگردانی کر کے اس پر غور فرمایئے کہ خُود شاعر اپنے کلام کا انتخاب کر رہا ہے۔ سو یہ بھی کوئی کھیل نہیں ہے۔ ہر چند بظاہر یہ بہت آسان بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سلسلے میں بھی تقریباً وہی دُشواریاں اور پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں جن کا اُوپر ذِکر ہو چکا ہے۔
اِس میں کوئی شک نہیں کہ دوسروں کے مقابلے میں ہر شخص، اور بالخصوص ہر شاعر اپنی ذات و

شاعری سے اِس قدر واقف ہوتا ہے کہ دوسروں کے واسطے اتنی معرفت ممکن نہیں ہے لیکن انسان اتنا حیرتناک اور پیچیدہ حیوان ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی طبّاع و فطین کیوں نہ ہو، ثباتِ عقل و فکر کی موجودگی میں، یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ اُسے اپنی ذات کی معرفتِ تام حاصل ہوچکی ہے

ہمارے حال کو دُنیا بھلا کیا جان سکتی ہے!

بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں!

اور یہ غلط اندازے دو وجوہ کی بنا پر قطعی فطری چیزیں ہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ شدید ترین حُبِّ ذات کی بنا پر ہم اپنے ہر نقص و عیب پر خوش نما پردے ڈال کر خود اپنے کو فریب دیا کرتے ہیں اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی ذات سے چُونکہ انتہائی قُرب حاصل ہوتا ہے اس لئے یہ انتہائی قُرب ہمارے واسطے اس بات کو بیحد دُشوار بنا دیتا ہے کہ ہم اپنے کو اچھی طرح دیکھ اور پرکھ سکیں۔

ہے سب سے بڑا فاصلہ قُربِ کامل
اپنی خلوت سرا میں جاؤں کیونکر

سو اس صُورت میں یہ بہت ممکن ہے کہ:

(۱) شاعر نے اپنی ذات و شاعری کے متعلق جو رائے قائم کی ہو، وہ قطعی غلط، یا صحیح کم اور غلط زیادہ ہو۔

(۲) نیز انتخاب کے وقت اُس کا مُوڈ خراب، یا مزاج ناسازگار ہو۔

(۳) اُس وقت اُس پر کوئی خاص جذبہ شدّت کے ساتھ طاری ہو۔

(۴) رات یا دوپہر کی غذا، یا موسم کی شدّت ذہن پر بُرا اثر ڈال رہی ہو۔

(۵) اُن شخصیتوں میں سے بعض یا اکثر سے اُس کے دل میں فرق آگیا ہو جن سے اُس کی

بعض نظمیں وابستہ ہیں۔

(۶) دفعتہً کوئی کرخت، غمگین یا سُریلی آواز نے نظامِ اعصاب و عملِ انتخاب میں اختلال پیدا کر دیا ہو۔

(۷) اچانک طور سے کوئی ایسی موروثی خصلت، یا ایسی ماحولی کیفیت قوّت کے ساتھ اُبھر آئی ہو۔ جو بعض نظموں کو اعلیٰ اور بعض کو ادنیٰ قرار دیتی ہے۔

(۸) اور وہ ماضی کے بعض عقاید و نظریات اور معمولات و مرغوبات کو ترک اور بعض دوستوں اور عزیزوں سے مایوس، اور بعض محبوبوں سے دل برداشتہ ہو چکا ہو۔ اور اُس میں بعض نئے خیالات پختہ ہو چکے اور بعض پختہ ہو رہے ہوں۔ بعض قدیم عادات، خیالات فنا ہو چکے ہوں، اور بعض فنا ہو رہے ہوں۔

تو ان تمام حالتوں اور ان کے مُماثل تمام دیگر حالات میں خود شاعر بھی اپنا صحیح ترین انتخاب کرنے سے قاصر رہ جائیگا، اور ان تمام نظموں کو نظر انداز کر دیگا، خواہ شاعرانہ حیثیت سے وہ کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہوں جو اُسی کے موجودہ نقطۂ نظر اور اس کی وقتی کیفیت سے اب کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔

بہر حال اس میدان کا اور چھور اور اس دریا کی تھاہ نہیں مل سکتی ہے اور مجبور ہو کر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی انتخاب و انتقاد تقریباً امکان سے خارج ہے اور جب خود ادیب و شاعر اس سے بہ احسن الوجوہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو بیچارے ناقد سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن اس کے باوصف اپنے ناشر کے پاسِ خاطر سے میں اس کام کو انجام دے رہا ہوں، کیونکہ ہر نامراد مصنّف اپنے بامُراد ناشر کے پاسِ خاطر پر مجبور ہوا کرتا ہے۔

خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

"خطا نمودہ ام" کی حد تک تو یہ مصرع یہاں بجا طور سے چسپاں ہو رہا ہے، لیکن "چشمِ آفریں دارم" کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

اب تک میری غنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، تقریباً اُن سب کا انتخاب اس میں شامل کیا گیا ہے، لیکن اس کا نہایت سختی کے ساتھ اہتمام کیا گیا ہے کہ انتخاب نہایت ہی مختصر رہے۔ ظاہر ہے کہ اِس انتہائی اختصار کی بناء پر سیکڑوں ایسی نظموں کو نظر انداز کر دینا پڑا ہے، جو اِس مجموعے کی نظموں کے بالکل مساوی اور ہم مرتبہ و ہم وزن ہیں۔

اختصار کے باعث ہر قدم پر یہ مشکل پیش آئی ہے کہ دو مساوی حیثیت کی نظموں میں سے کس کا انتخاب کیا جائے اور ہر مرتبہ آنکھیں بند کر کے، بلا وجہِ معقول، ایک کو اختیار اور ایک کو نظر انداز کر دینا پڑا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کتاب کا حجم چھ، ساڑھے چھ سو صفحے کا ہو جاتا، اور کاغذ کی نایابی و گرانی کے زمانے میں اتنی ضخیم کتاب کی طباعت میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

اِس انتخاب محل کے نو پھاٹک ہیں۔ اُن میں سے انتخاب کی خاطر، میں نے ہر پھاٹک کو کھٹکھٹایا۔ بعض پھاٹک جلد کھل گئے، بعض کے کھلنے میں دیر، اور بعض میں بہت دیر لگی۔ اور بعض کے کھولنے میں تو لوہے لگ گئے اور دو پھاٹکوں نے تو یہاں تک ستایا کہ سیڑھی لگا کر کودنا اور انہیں اندر سے کھولنا پڑا۔

اور جب ایک ایک کر کے تمام پھاٹک کھول لئے تو دبے پاؤں اُن کے احاطے میں داخل ہوا۔ خشک پتیاں میرے قدموں کے نیچے کراہنے اور شاخوں کے درمیان تنے ہوئے جالے میری پیشانی سے مس ہو ہو کر بجنے اور ٹوٹنے لگے۔ آگے بڑھا تو گزرے ہوئے ماہ و سال ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔ بیتی ہوئی گھڑیوں نے اپنے چہروں سے آہستہ آہستہ نقابیں اٹھائیں اور بھولی بسری واردتوں، اور کہی سُنی ہوئی کہانیوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں۔

اوہ ماضی کی سیر۔ رُوح فرسا، زہرہ گداز ماضی کی سیر۔ میں دوبارہ اُن رَوشوں سے گزرا، اُن کنجوں میں گنگنایا، اُن چشموں کے سامنے رویا، اُن لچکتی شاخوں کی چھاؤں میں سر جھکا کر کھڑا ہوا، اُن ساحلوں پر ٹہلا، اُن موڑوں پر ٹھٹکا، اُن ریگستانوں میں دوڑا، اُن رنگین پہاڑیوں پر چڑھا، اُن خلوت کدوں میں نمناک آنکھوں، اور خشک ہونٹوں کے ساتھ داخل ہوا، اور اُن کی پگھلی ہوئی شمعوں کے موم پاروں کو حسرت و عبرت کے ساتھ دیکھا جہاں یادش بخیر میری نوعمری کھیلا کرتی تھی، جہاں میری مسیں بھیگی تھیں۔ جہاں طلوع و غروب کی رنگینیوں میں پہلے پہل مجھ پر الہام کے موتی اور لب و رُخسار کے پھول برسے تھے۔ اور جہاں میری نوجوانی، انگاروں سے دہکی اور پنکھڑیوں سے مہکی ہوئی نوجوانی جھوما کرتی تھی۔

میں نے اِس انتخاب کی خاطر دوبارہ اُن شبستانوں کو روشن، اُن باغوں کو شاداب، اُن آسمانوں کو پُر سحاب، اُن زمینوں کو سرسبز، اُن دریاؤں کو رواں، اُن اُمنگوں کو رقصاں، اُن تاروں کو لرزیدہ، اُن رشتوں کو پیچیدہ، ان جلوؤں کو غلطاں، اور اُن رخساروں کو فروزاں کیا جو میری نوجوانی کی محبوب ترین متاع اور میری نوعمری کے تاج کے دمکتے ہوئے ہیرے تھے۔ ایسے ہیرے جن کے ہر گوشے پر صدہا کوہِ نور قربان کئے جا سکتے ہیں۔

میں نے پھر ایک بار اُن سُہانی صبحوں کو ذہن کے اُفق پر طالع کیا جو میرے شباب کے شبنم آلود سبزہ زاروں پر مُسکرایا کرتی تھیں۔ میں نے پھر ایک بار اُن سلونی شاموں کو آواز دی جو سُرخ لبوں اور سیاہ زُلفوں کے سائے میں تارے چمکایا کرتی تھیں۔ میں نے دوبارہ اُن دوستوں کو ذہن میں حاضر کیا جن کے قہقہوں سے میرے چہرے پر سُرخی دوڑ جایا کرتی تھی۔ اُن میں سے جو زندہ ہیں، ماہ و سال کی پرچھائیاں اُن کے چہروں کی شادابی کو ڈھانک چکی ہیں۔ اور جو اس کہنہ سرا میں اب موجود نہیں ہیں، اُن کی پیشانیاں میرے آنسوؤں کے اندر جھلکا کرتی ہیں۔

غرضکہ اس انتخاب کے چلنوں میں نے ایک ایک کر کے اُن تمام دہکتے ہوئے ولولوں کو اپنے دُکھتے ہوئے دل میں برانگیختہ کیا جو کبھی میرے وجود پر آتش فشانی کیا کرتے تھے۔ اور اپنے دل کو دوبارہ اُن جمالوں اور خیالوں، نیز اُن راتوں اور وارداتوں سے ڈسوایا جن کا زہر کبھی میرے رگ و پے میں دوڑتا پھرتا تھا۔

عُمر کی اِس خُنک و سنجیدہ منزل میں ماضی کے بھڑکتے جذبات کو جگانا، اور دو دو پٹیوں کے پھُنکارتے ہُوئے ولولوں سے اپنے کو دوبارہ ڈسوانا، ایک ایسا زبردست سانحہ ہے، جس کی نظیر شہدا کے مجاہدانہ کارناموں کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔

نکلی لبِ گُل سے آہ، خوشبو بن کر
آئی سَر میں رمیدہ آہُو بن کر
سَر سے گئی دِل میں اُن کی تصویر لیے
تصویر ٹپکنے لگی آنسُو بن کر

آتشکدہ

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ، انقلاب و انقلاب و انقلاب!

اِنسان کا ترانہ

ہماری سوسائٹی

بارگاہِ قدرت

نیا میلاد

باغی انسان

پست قوم

بغاوت

شکستِ زندان کا خواب

نظامِ نو

وفادارانِ ازلی کا پیام

خُونی بینڈ

سلام

حادثے

اِنسان کا ترانہ

مری شان سے بحر و بر کانپتا ہے
شجر کانپتا ہے، حجر کانپتا ہے

مرے تیشۂ نو کی جھنکار سُن کر
دلِ سختِ کوہ و کمر کانپتا ہے

مرے درسِ اخلاقِ نو کی صدا سے
تنِ "عیب" و جسمِ "ہُنر" کانپتا ہے

مری شرحِ جبرِ "مشیّت" کے آگے
نہاں خانۂ "خیر" و "شر" کانپتا ہے

مرے دستِ جاں بخش کی دستکوں سے
حصارِ ہلاکت کا در کانپتا ہے

مرے مرگ بر دوش قہر و غضب سے
دیارِ مسیح و خضر کانپتا ہے

مری نُور و ظلمت کی تفسیرِ نو سے
مُعمّائے شام و سحر کانپتا ہے

مری فکرِ غوّاص کے تیوروں سے — صدف مُضطرب ہے گہر کانپتا ہے
مری ضربتِ دستِ گیتی شکن سے — جواہر لرزتے ہیں، زر کانپتا ہے
مرے عزمِ پرواز کے دبدبے سے — دلِ نجم و شمس و قمر کانپتا ہے
مرے ذوقِ تسخیرِ قُدرت کے آگے — عناصر کا قلب و جگر کانپتا ہے
مرے تازہ آئینِ فکر و نظر سے — نظامِ قضا و قدر کانپتا ہے
مرے دام سے طائرِ وقتِ اعظم — بہ ایں قوّتِ بال و پر کانپتا ہے
مرے چاک کی تو بہ تو گردشوں سے — دلِ کُوزہ کیا، کُوزہ گر کانپتا ہے

قسم جوشؔ دُنیا کے ہر خُشک و تر کی
کہ مجھ سے ہر اک خُشک و تر کانپتا ہے

ہماری سوسائیٹی

حوصلے سرنگوں، اُمیدیں شل ۔۔۔ آرزو، بارِ یاس سے بوجھل
نشہ۔ بُجھتا ہُوا سا ایک شرار ۔۔۔ کیف۔ گِرتی ہُوئی سی اِک دیوار
ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن ۔۔۔ ہر ظرافت میں ایک پِھیکا پَن
شَرم سے آب آب جولانی ۔۔۔ ہر ہنسی۔ شرمسار۔ کِھسیانی
خال و خط پر دُھواں بناوٹ کا ۔۔۔ کرب۔ بالقصد مُسکراہٹ کا
چہچہے سرد، زمزمے مجرُوح ۔۔۔ قہقہے تک تھکے ہُوئے بے رُوح
صرف لے دے کے زرق برق لباس ۔۔۔ ولولے اشکبار۔ رُوح اُداس
زرد چہرے۔ نقابِ زرّیں میں ۔۔۔ سرد لاشیں۔ لباسِ رنگیں میں

نہ تلاطُم، نہ تازگی، نہ ترنگ
یہ ہے اپنی سوسائیٹی کا رنگ

بارگاہِ قدرت میں

اشتراکی رِند کا مشورہ

اُٹھ کہ اُٹھتی نہیں اَب سینۂ ایّام سے آگ — دلِ آفاق پہ برسا اُفقِ جام سے آگ
دامنِ تر کو بنا حاملِ برق و آتش — کہ نکلتی نہیں اب جامۂ احرام سے آگ
نہ رہا کوثر و تسنیم کے چھینٹوں میں اثر — اب دل و جاں میں لگا بادۂ گلفام سے آگ
آج اُسے کفر کے جھونکوں سے فروزاں کر دے — کل لگائی تھی کلیجوں میں جو اسلام سے آگ
کام کے اَب نہ رہے قہر و غضب کے اخگر — اب زمانے میں لگا بخشش و انعام سے آگ
اَب تو گفتار میں خود آگ ہے بجھنے کے قریب — تُو نے بھڑکائی تھی جو نامہ و پیغام سے آگ

وقت آیا ہے کہ بے پردہ ہو اے برقِ جمال — اب دہکتی نہیں سینوں میں ترے نام سے آگ
برق رفتار جوانوں کو دکھا راہِ شرار — کہ بھڑکتی نہیں پیرانِ سُبک گام سے آگ
خندۂ "خواجۂ خوش وقت" سے نکلے گا نہ کام — اب لگا اشکِ غم "بندۂ ناکام" سے آگ
حُکم دے "شرِ" "خوش آغاز" کو ضَو باری کا — کہ نکلتی نہیں اب "خیرِ" بد انجام سے آگ
"خلوتِ خاص" کے شُعلے تو بہت دیکھے ہیں — آج برسا اُفقِ "جلوہ گہِ" عام سے آگ
دُور ہے وادیٔ ایمن ہو کہ طُورِ سینا — اب یہ موقع ہے کہ برسا دے ہر اک بام سے آگ

جوشؔ کیا صُبح کو ہو دیکھیے تنظیمِ عالم
آج روشن ہے مرے دِل میں سرِ شام سے آگ

نیا میلاد

(۱)

اَب سے تقریباً چھہتّر سال پہلے ہمنشیں
مُبتلا تھی سخت تشویش و تذبذب میں زمیں

دہر کا بُوڑھا تمدّن مِل چُکا تھا خاک میں
اور جواں دستُور گُم تھا مجلسِ ادراک میں

خاک پر رکھّی ہُوئی تھی کہُنہ قدروں کی جبیں
اور نئی قدریں تھیں قصرِ ذہن میں خلوت نشیں

خستہ جاں تہذیبؔ اُتاری جا چکی تھی قبر میں
اور نئی تہذیبؔ مضمر تھی حجابِ ابر میں

پُشت پر ٹُوٹی پڑی تھیں کچھ پُرانی سیڑھیاں
اور آگے کوئی رہبر تھا، نہ کوئی نردباں

دِین کے ڈھارے کے اندر بجلیوں کی رَو نہ تھی
اور بے دینی میں شفّاف و نمایاں ضَو نہ تھی

ہو چکا تھا پوچ و مہمل حرفِ آئینِ قدیم
اور جدید اخلاق تھا زیرِ حجاباتِ عظیم

بے ضیا پیغمبری تھی، کافری تاریک و تار
کس غضب کی کشمکش تھی، کس بلا کا انتشار

بن چکا تھا، نظمِ امروز ایک برقِ امن سوز
اور تھا دستورِ فردا کارخانے میں ہنوز

کُہنگی بے رُوح تھی، اور جدّتیں بے برگ و بار
وہ اُدھر مجبور تھی، اور یہ اِدھر بے اختیار

وہ ترازو، تولتی تھی جو حقائق کو کبھی
وقت کے کُھن سے پڑی تھی خاک پر ٹوٹی ہوئی

عالمِ ماضی، بطونِ گور کی پستی میں تھا
عالمِ آئندہ، بطنِ شاہدِ ہستی میں تھا

نسلِ انسانی کھڑی تھی ششدر و آتش بجاں
اِک عبوری موڑ پر۔ دو عالموں کے درمیاں

کہنہ عالم میں حیات آمیز رقص و رم نہ تھا
جلد پیدا ہو، نئے عالم میں اتنا دم نہ تھا

(۲)

آج لیکن عصرِ حاضر کا سماں کچھ اور ہے
اب زمیں کچھ اور ہے، اب آسماں کچھ اور ہے

ہاں وہی عالم کہ تھا مدّت سے جس کا اشتیاق
آج پیدا ہو رہا ہے باہزاراں طمطراق

جن کو یہ ڈر ہے کہ یہ مولود ہوگا نا سعید
اُن کے اَوجِ ذہن پر ہے پرتوِ وہمِ شدید

اور جو کہتے ہیں جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
کہہ دو چُپ ہو جائیں اِک جشنِ دگر ہونے کو ہے

آج جو چھایا ہوا ہے زندگی پر یہ دھواں
اِس دھوئیں میں پرفشاں ہیں سیکڑوں رنگینیاں

اِس شبِ جامد میں، صُبحِ سیلِ احساسات ہے، اب بھی مانا رات ہے لیکن یہ پچھلی رات ہے
شب کے اِس دُھندلے اُفق سے با ہزاراں آب و تاب اَمن و آسائش کا طالع ہو رہا ہے آفتاب
تیز تلواروں سے ہو کیوں عصرِ نو چیں بر جبیں یہ تو اِس موسم کے پھل ہیں، تیز تلواریں نہیں
اِن پھلوں کو آدمی چکھ کر اَمر ہو جائے گا آفتابِ حُبِّ انساں جلوہ گر ہو جائے گا
اِک انوکھی ضَو سے دُنیا جگمگا دی جائے گی شمع، برتر آدمیّت کی جلا دی جائے گی
کہہ رہا ہے صاف لفظوں میں زمیں کا خلفشار دردِ زِہ میں مُبتلا ہے، مادرِ لیل و نہار
ہِل رہا ہے یہ جو توپوں کی گرج سے آسماں یہ تو ہے دراصل وضعِ حمل کی آہ و فُغاں
جس کو ہے اِسقاط کا اندیشہ وہ دیوانہ ہے یہ حضورِ ارتقا، اک حرفِ گُستاخانہ ہے
جنگ کی بھٹّی سے آنے ہی پہ ہے بادِ مُراد ارتقا پائندہ باد و نوعِ اِنساں زندہ باد
آ چکی ہے نُقطۂ تکمیل پر حیوانیت دیکھ پیدا ہو رہی ہے اِک جدید انسانیت
پرتوِ تائید ہے اِس پردۂ تردید میں ایک صالح زندگی ہے معرضِ تولید میں

آ رہا ہے تازہ وارث، عالمِ ایجاد کا
جلد تر اعلان کر دو اِک نئے میلاد کا

باغیِ انساں

حکمراں آج بھی ہے پیرِ مغاں کیا کہنا
وہی دفتر ہے، وہی مُہر و نشاں کیا کہنا

عقل کی تُند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے
پھر بھی ہے شمعِ جنوں شعلہ فشاں کیا کہنا

کب سے تقویٰ ہے مزامیر و ترنّم کے خلاف
آج بھی نغمہ ہے آشوبِ جہاں کیا کہنا

کب سے خورشید کی حدّت میں ہے فرمانِ سکوت
پھر بھی جنبش میں ہے ذرّوں کی زباں کیا کہنا

ذرّے ذرّے پہ جہنّم کی لگی ہیں مُہریں
پھر بھی دُنیا پہ ہے جنّت کا گُماں کیا کہنا

کب سے ادیان کی خشکی میں ہے تبلیغِ سراب
وہی رونق ہے سرِ آبِ رواں کیا کہنا

عقل کے دور میں بھی عشق نہیں ہے خاموش
وہی نالے ہیں، وہی شورِ فغاں کیا کہنا

کب سے ہے ذوقِ نظر حکمِ شریعت سے حرام
وہی نظریں ہیں، وہی حسنِ جواں کیا کہنا

آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلبگاری ہیں
چشمِ انساں ہے بہرسُو نگراں کیا کہنا

ہاں بہ ایں شدّتِ آیات و احادیثِ حجاب
دستِ خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا

شبنم و برف کے اِس حلقۂ نمناک میں بھی
اُٹھ رہا ہے دلِ انساں سے دھواں کیا کہنا

تُرش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا

زُہد کے کوُچے ہلاکت میں بھی ہیں گرمِ خرام
زُلف بر دوش مسیحا نفساں کیا کہنا

کب سے قرنوں کا ہے شانوں پہ اُٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہے جہانِ گزراں کیا کہنا

سینۂ دھر ہے گو تیرِ حوادث سے فگار
پھر بھی ابرُو کی لچکتی ہے کماں کیا کہنا

کب سے ہے نُطقِ رسالت پہ رواں ہجوِ شراب
وُہی ہلچل ہے سرِ کوئے مُغاں کیا کہنا

لِلّٰہ الحمد کہ خود "حکمِ خُدا" کے باوصف
ہے وُہی گرمیٔ بازارِ بتاں کیا کہنا

آفریں باد کہ اِس جبرِ مشیّت پہ بھی ہے
دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

پست قوم

اپنے خلاف بات سُنیں، اور خُوش رہیں
ذہنوں میں وہ طہارت و وسعت کہاں ہے جوشؔ

چلتی ہے کوہ و بحر کو جو رَوندتی ہُوئی
اہلِ جُمود میں وہ محبّت کہاں ہے جوشؔ

اپنی اِہانتوں کا کچھ احساس کر سکیں
اِتنا، دِلوں میں جذبۂ غیرت کہاں ہے جوشؔ

تیری شرابِ تُند کو برداشت کر سکے
اِس مُلک میں وہ ظرف، وہ قوّت کہاں ہے جوشؔ

ہم شاعروں کی وضعِ جنوں کے اُٹھائیں ناز
اہلِ وطن میں اتنی شرافت کہاں ہے جوشؔ

اہلِ نظر کی قدر کریں حسبِ مدّعا
ابنائے مُلک میں وہ بصیرت کہاں ہے جوشؔ

گردن کا طوق، پاؤں کی زنجیر کاٹ دے
اِتنی غُلام قوم میں ہمّت کہاں ہے جوشؔ

اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کر سکے
اِتنی، ذلیل مُلک کو فُرصت کہاں ہے جوشؔ

اِک حرفِ گرم سُنتے ہی کَو دے اُٹھیں دماغ
ہندوستان میں وہ حرارت کہاں ہے جوشؔ

بغاوت

ہاں بغاوت! آگ، بجلی، موت آندھی میرا نام
میرے گردوپیش اجل، میری جلو میں قتلِ عام

زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اُٹھتی ہے مری چینِ جبیں سے کائنات

جنگ کے میداں میں میری سیف کی اللہ ری ضَو
خاک بن جاتی ہے بجلی، بَرف دے اُٹھتی ہے لَو

ذکر ہوتا ہے مرا پُرہول پیکاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ

اللہ اللہ کروٹیں میرے دلِ آزاد کی
جن سے گر جاتی ہیں ڈاٹیں قصرِ استبداد کی

میری اک جُنبش سے ہوتا ہے جہاں زیر و زبر
میری سرتابی ثُریّا کا جُھکا دیتی ہے سر

ایک چنگاری مری جنّت کو کرتی ہے تباہ
مانگتا رہتا ہے میری آگ سے دوزخ پناہ

الحذر! میری کڑک کا زور ہنگامِ مصاف
صاف پڑ جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف

اللہ اللہ بزمِ ہستی میں مری گُل باریاں
ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو، ریزہ ریزہ اُستخواں

الامان والحذر! میری کڑک، میرا جلال
خُون آشاموں کی گرج، طُوفان، بربادی، قتال

برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں، کٹار
بیرقیں، پرچم، عَلَم، گھوڑے، پیادے، شہ سوار

آندھیوں سے میری اُڑ جاتا ہے دُنیا کا نظام
رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام

موت ہے خُوراک میری، موت پر جیتی ہُوں مَیں
سیر ہو کر گوشت کھاتی ہوں، لہو پیتی ہُوں مَیں

پیاس سے باہر نکل پڑتی ہے جب میری زباں
بہنے لگتی ہیں سرِ میداں لہُو کی ندّیاں!

جنگ کی صُورت سے گو ہنگامہ کرتی ہُوں شرُوع
امن کی صُبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلُوع

میرا مولد مفلسی کا دل ہے، عُسرت کا دماغ
میری پیدائش کے حجرے میں نہیں جلتا چراغ

گود میں ناداریوں کی پرورش پاتی ہُوں مَیں
بے زری کے بازوؤں پر زُلف بکھراتی ہُوں مَیں

بھُوک سے ہر چند کیا کیا سرگراں ہوتی ہُوں مَیں
بھُوک ہی کا دُودھ پی پی کر جواں ہوتی ہُوں مَیں

گرم نالے مُنہ اندھیرے سے جگاتے ہیں مجھے
اشکِ غم ہر صُبح آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

مجھکو بچپن کے زمانے ہی سے ہر صُبح و مَسا
پیٹ کی ماری ہُوئی مخلوق دیتی ہے غذا

جس کو حاصل زندگی کا کچھ مزا ہوتا نہیں
کچھ بھی جس کے پاس ماضی کے سوا ہوتا نہیں

جس کی چشمِ تر میں یُوں کھاتے ہیں ارماں پیچ و تاب
دھار پر تلوار کی جیسے شعاعِ آفتاب

ختم ہو جاتا ہے جب اہلِ جہاں کا غُلغُلہ
رات کے آغوش میں کُھلتا ہے میرا مدرسہ

کُھل کے پُوری سانس لینے سے بھی گھبراتی ہوں میں
درس لینے کیلئے پنجوں کے بل جاتی ہوں میں

ہر قدم پر بھُوت آوازیں سُناتے ہیں مجھے
تیرہ دیواروں کے سائے تک ڈراتے ہیں مجھے

ایک دُنیا سے نرالی ہے مرے مکتب کی شان
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں اور کُھلے رہتے ہیں کان

بستۂ قرطاس ہو سکتی نہیں میری کتاب
خُون کی چادر پہ چھپتا ہے مرا خُونی نصاب

اُف! در و دیوار میرے مدرسے کے الاماں!
درس دیتی ہیں جہاں سہمی ہُوئی سرگوشیاں

دیکھنے سے جن کے پتھر کا بھی دل ہو جائے شق
مجھکو وہ اُترے ہوئے چہرے پڑھاتے ہیں سبق

اوّل اوّل جان دینے کا سبق لیتی ہوں میں
آخر آخر جان لینے کا سبق لیتی ہوں میں

کچھ دنوں تو فرطِ حیرت سے میں رہتی ہوں خموش
آخر آجاتا ہے میری روحِ سرتابی کو جوش

پھر تو میں چنگھاڑتی ہوں خوفناک انداز میں
موت کی آواز ہوتی ہے مری آواز میں

برق کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں گفتاریں مری
میان سے باہر اُبل پڑتی ہیں تلواریں مری

موت بن کر زندگی کے سر پہ چھا جاتی ہوں میں
سب سے پہلے بڑھ کے غدّاروں کو کھا جاتی ہوں میں

سوزِ ملّت سے جو پہلو مُشتعل رکھتے نہیں
ہاں وہی غدّار سینوں میں جو دِل رکھتے نہیں

سلطنت کی سمت پھر بڑھتی ہُوں بل کھاتی ہُوئی
قید اور قانُون کو ذِلّت سے ٹھکراتی ہُوئی

اپنی رَو کی گرد میں صحنِ زمیں اُلٹے ہُوئے
میان سے خنجر نکالے آستیں اُلٹے ہُوئے

باندھتی ہُوں شہریوں کے سر پہ یہ کہہ کر کفن
تم ہو اشجع، ناوک افگن، صف شکن، شمشیر زن

تم ہو غازی، جنگجو، لشکر شکن، میرِ سپاہ
تم ہو رُستم، مردِ میداں، شیر دل، عالم پناہ

تم ہو سرلشکر، سپاہی، برق پیما، سخت کوش
تم ہو صفدر، سُورما، ساونت، سرکش، سرفروش

ایڑیاں تم اور رگڑو آب و ناں کے واسطے
ریڑھ کی ہڈّی ہو تم جسمِ جہاں کے واسطے

اے جواں مردو! یہ ذِلّت کس لیے سہتے ہو تم؟
مرد ہو کر ٹھوکروں کی زد پہ کیوں رہتے ہو تم؟

مادہ سیرت بن کے تو رہتے نہیں دُنیا میں نر
ٹھوکروں کیواسطے ہوتا نہیں مردوں کا سر

لختِ دِل انسان کھائے اور خُونِ دل پیے
تُف ہے، اس جینے پہ، مر مر کر جیے تو کیا جیے

سچ کہو تُم ننگِ محکومی سے شرماتے نہیں؟
کیا تم اپنی عورتوں کے سامنے جاتے نہیں؟

کب نِکالو گے تمنّائیں دلِ برباد کی
کیا ہوئیں تیغیں تمھارے نامور اجداد کی؟

اے جواں مردو! خُدا را باندھ لو سر سے کفن
سر برہنہ پھر رہی ہے عزّتِ قوم و وطن

ہاں زمیں کو زیر کر کے آسمانوں پر چڑھو
ہاں بڑھو اے صف شکن ہیرو! بڑھو جلدی بڑھو

پاؤں میں تا چند زنجیرِ غلامی کی خراش؟
صرف اِک جُنبش! ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش

میری آوازوں سے کانپ اُٹھتا ہے رُوحوں کا سکوں
جذبۂ غیرت کی آنکھوں میں اُتر آتا ہے خُوں

شور اُٹھتا ہے محض اِک وہم ہے دار و رسن
یا تو اب ہم تاج ہی پہنیں گے یا خُونیں کفن

کپکپاتی ہے زمیں اُٹھتا ہے ہلکا سا غبار
دوڑنے لگتے ہیں مرکب بڑھنے لگتے ہیں سوار

طبل کی دوں دوں سے جل اُٹھتے ہیں آنکھوں میں چراغ
جھنجھناتے ہیں جلاجل سنسناتے ہیں دماغ

کھُلنے لگتا ہے مگر جس وقت پرچم جنگ کا
پہلے بڑھ کر میں حکومت کو یہ دیتی ہُوں صدا

اے جفا پرور امارت! دیکھ ناداروں سے بھاگ
بھاگ دیوانوں کی خُوں آشام تلواروں سے بھاگ

موت کا پیغام ہے بپھرے ہُوئے شیروں کا وار
مدّعی! اکفِ دُر دہاں آبادیوں سے ہوشیار

خلق ہے بیتاب تیرا مُنہ جھُلسنے کے لئے
تیرے سونے پر ہے اب لوہا برسنے کے لئے

تیرا مطبخ مفلسوں کی بھُوک کھا جانے کو ہے
تیرے زر کی سُرخیوں میں آگ لگ جانے کو ہے

حُرّیت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون؟
جذبۂ خلقِ خدا کو فتح کر سکتا ہے کون؟

اب بھی آنکھیں کھول اے جنِ خودی، دیوِ ریا | جذبۂ خلقِ خدا ہے اصل میں عزمِ خدا
راہ سے اپنی مشیت کو ہٹا سکتا ہے کون؟ | عظمِ خلاقِ جہاں کا سر جھکا سکتا ہے کون؟

گونجنے لگتی ہیں جب میری صدائیں مثلِ صور
سر اٹھا کر مسکراتا ہے حکومت کا غرور

مضحکہ اور قطرۂ شبنم کا، انگاروں کے ساتھ | پنکھڑی اور ناز سے پیش آئے تلواروں کے ساتھ
عقل کا دستِ سبک رخشِ جنوں کی باگ پر | قہقہہ خس کا کڑکتی بجلیوں کی آگ پر
ایک مٹی کے دیئے کا طنز اور کعبے کا طاق | نرم و نازک آبگینہ، اور پتھر سے مذاق
اس تمسخر سے مرے سینے میں لگ جاتی ہے آگ | قلعۂ شاہی کی جانب موڑ دیتی ہوں میں باگ
پھر تو جاتا ہے جدھر میرا جنونِ تند خو | پشت پر ہوتی ہیں لاشیں، ہڈیاں، ڈھانچے، لہو
میرے گرد و پیش کی ہنگامہ خیزی الاماں | شور، غوغا، غلغلہ، فریاد، واویلا، فغاں
اللہ اللہ میرے دہشتناک خونی ولولے | آندھیاں، طوفان، تلاطم، سیل، صرصر، زلزلے
ابتری، وحشت، تزلزل، طنطنہ، دہشت، فساد | دبدبے، گرمی، کشاکش، دندنے، ہلچل، جہاد
کنگرے ایوانِ شاہی کے جھکا دیتی ہوں میں | جبر و استبداد کی چولیں ہلا دیتی ہوں میں
دندناتی گنبدِ زریں میں گھس جاتی ہوں میں | چاٹ کر سونے کا پانی آگ برساتی ہوں میں

میرے خرقِ بے کُلہ کے سامنے بے اختیار
کانپتا ہے طُرّۂ طرفِ کُلاہِ شہریار

باندھ کر پیماں گدا کی خفتہ سامانی کے ساتھ
کھیلنے لگتی ہوں ہولی خُونِ سُلطانی کے ساتھ

کِس سے رُکتی ہُوں جب اپنی بات پر آتی ہُوں میں
سلطنت کے سَر کا گُودا تک چبا جاتی ہُوں میں

زیر دستوں کو دِلا کر خُونِ حاکم سے خراج
قیدیوں کے سر پہ رکھ دیتی ہُوں آزادی کا تاج

شعلے کے مانند یُوں لیتی ہُوں پھر انگڑائیاں
سینۂ ارض و سما سے اُٹھنے لگتا ہے دُھواں

الاماں! میرا جنُوں پروردۂ تمرُّد، الاماں!
آ سُناؤں میں تجھے دو حرف میں یہ داستاں

جب ازل میں سجدۂ آدم کا اُٹھا تھا سوال
ہاں اُسی ہلچل کے موقع پر کہ تھا وقتِ جلال

خود خدائے برتر و قہّار سے افلاک پر
کی تھی میں نے گفتگو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

رُعبِ سلطانی سے یہ چہرہ اُتر سکتا نہیں
جو خدا ہی سے لڑے شاہی سے ڈر سکتا نہیں

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آ کر یُوں جمع ہُوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھُوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جُنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے بے نُور ہے چہرہ سُلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا اُن کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو رُوحِ مِلّت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خُون چُرایا کرتے تھے
اِک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا اُن کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اِک روز اِسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سَنبھلو کہ وہ زنداں گُونج اُٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھُوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

نظامِ نو

کھیل ہاں اے نوعِ انساں ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پابجولاں ہے تو کیا؟

مسکرانے کے لئے بے چین ہے صبحِ وطن
اور چندے ظلمتِ شامِ غریباں ہے تو کیا؟

چل چکی ہے پیشوائی کو نسیمِ باغِ مصر
آج یوسف مبتلائے چاہِ کنعاں ہے تو کیا؟

اب کھلا ہی چاہتا ہے پرچمِ بادِ مراد
آج ہستی کا سفینہ وقفِ طوفاں ہے تو کیا؟

اٹھنے والی ہے نگارِ صبحِ داماں کی نقاب
آخرِ شب زحمتِ دردِ فراواں ہے تو کیا؟

ختم ہو جائیگا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطحِ بزمِ امکاں ہے تو کیا؟

کھل رہی ہے خندۂ گیتی کی زلفِ خم بہ خم
اس کرے پر آج دامِ چشمِ گریاں ہے تو کیا؟

آگئیں دل سے تبسم کی شعاعیں تا بہ لب
اشکِ خوں آلود اگر عنوانِ مژگاں ہے تو کیا؟

کل اسی موجِ نفس پہ رقص فرمائے گا لحن
آج آہوں سے اگر یہ تار لرزاں ہے تو کیا؟

مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب
ابرِ غمِ زلفِ جہاں پہ بالِ جُنباں ہے تو کیا؟

بلبلِ دانش پر افشاں ہے چہکنے کے لئے
آج مرغِ وہم ذہنوں پہ غزل خواں ہے تو کیا؟

کل بفیضِ عقل بن جائے گا خالص آدمی
آج ہندو ہے تو کیا، پکا مسلماں ہے تو کیا؟

راہ میں ہے کارواں تشکیک اور تحقیق کا
آج اگر نادانیِ اوہام و ایقاں ہے تو کیا؟

ختم ہونے پر ہے تبلیغِ روایات و رسوم
آج اگر تفسیرِ حکمت جرم و عصیاں ہے تو کیا؟

نصب ہونے ہی پہ ہے میزانِ دیدار و دلیل
حکمراں اس وقت اگر بالغیب ایماں ہے تو کیا؟

کل عجائب خانہ ہوگا اور یہ ہیبِ مُردہ سر
آج اگر منبر پہ شیخِ پاک داماں ہے تو کیا؟

منزلیں طے کر چکا ہے آفتابِ فکرِ نو
آج اگر روحِ قدامت ظلمت افشاں ہے تو کیا؟

کل یہی بندہ الوہیت سے ہوگا شادکام
آج اگر بہتانِ عبدیت پہ نازاں ہے تو کیا؟

ناز کی محراب میں جلنے پہ ہے شمعِ نیاز
بر سرِ جنگ آج اگر لیلائے دوراں ہے تو کیا؟

جانور کا جانور بھی کل نہ ہوگا مدعی
آج اگر انساں کا انساں دشمنِ جاں ہے تو کیا؟

کل جواہر سے گراں ہوگی لہو کی بوند بوند
آج اپنا خون پانی سے بھی ارزاں ہے تو کیا؟

کھل رہا ہے وحدتِ اقوامِ عالم کا علم
آج انساں منکرِ توحیدِ انساں ہے تو کیا؟

سایہ افگن ہے ہیولیٰ برقِ ایواں سوز کا
آج صرفِ کشتِ سلطاں خونِ دہقاں ہے تو کیا؟

آسماں کو روندنے والی ہے رقصندہ زمیں
آسماں آج اس زمیں پر آتش فشاں ہے تو کیا؟

آ رہی ہے آگ لنکا کی طرف بڑھتی ہوئی
آج راون کا محل سیتا کا زنداں ہے تو کیا؟

دستِ غم خواری میں ہو گی کل زمامِ آب و ناں
آج اگر نامہربانی میر ساماں ہے تو کیا؟

بن رہا ہے صرصر و سیلابِ خونِ ہاشمی
آج ابو سفیان کے گھر میں چراغاں ہے تو کیا؟

ہو رہا ہے طبعِ فرمانِ حیاتِ جاوداں
موت اگر اب تک رگِ جاں پر خراماں ہے تو کیا؟

سینۂ خیاطِ عالم میں ہے طرحِ رختِ نو
آج اگر سلمائے ہستی چاک داماں ہے تو کیا؟

جوشؔ کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رسوا یہ مردِ نامسلماں ہے تو کیا؟

وفادارانِ ازلی کا پیام

شاہنشاہِ ہندوستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر، اے مُفلسوں کے بادشاہ
اے گداپیشیوں کے سُلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ، دریُوزہ گروں کے شہریار
اے ہمارے عالموں کے "حامیٔ دینِ مُبیں"
دورِ سیدؔ[1] کے "اولی الامر" "امیرالمومنیں"

ؔ[1] سرسید احمد خاں آنجہانی

اے رئیسِ پاک دل اے شہریارِ نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجئے سلام
راس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو
یوں ہی رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو
دل کے دریا نُطق کی وادی میں بہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھُل کے کہہ سکتے نہیں
لیکن اِتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور
ہند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضور
آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں
تن پہ اک دھجّی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں
تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں
شُکریہ اُن روٹیوں کا اے شہِ گردوں نشاں
روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خُدّام نے
آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے ؟

آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا
کھا بھی لیں گے آج اگر ڈٹ کر تو کل کھائیں گے کیا؟

صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام
کچھ دِلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام؟

آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قومِ نامُراد
کھائے جاتا ہے اُسے خُدّامِ عالی کا عِناد

معدہ محرُومِ غذا ہے، کِیسہ ہے محرُومِ زر
آپ کے عُمّال نے لُوٹا ہے ہم کو اِس قدر

آپ کے فرقِ مبارک کو دیا ہے جس نے تاج
آج اُس بھارت کا سَر ہے اور تیغِ احتیاج

ہر جبیں پر ہے شِکن، اِس کج کلاہی کی قسم
ہر مکاں اِک مقبرہ ہے، قصرِ شاہی کی قسم

آپ کے سَر پر ہے تاج، اے فاتحِ رُوئے زمیں
اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جُوتی نہیں

ہم وفاکیش، آپ کی نظروں سے بھی گر جائیں گے؟
آپ بھی ہم سے خُدا کی طرح کیا پھر جائیں گے؟

ہم سے باغی قِسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات
صرف مُوسیٰ بن کے فِرعَونوں سے مُمکن ہے نجات

ہم تو مُوسیٰ بن نہیں سکتے کِسی تدبیر سے
پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے

نوجواں بپھرے ہُوئے ہیں، بھُوک سے دِل تنگ ہیں
ذرّے ذرّے سے عیاں آثارِ حرب و جنگ ہیں

کشورِ ہندوستان میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں اِنقلاب!

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ!

ہم وفادارانِ پیشیں، ہم غُلامانِ کہُن!
قبر جِن کی کھُد چکی، طیّار ہے جِن کا کفن!

تُند رَو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی اُمنگوں کو دَبا سکتے نہیں
مدح اَب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یُوں سرکار کی
جیسے کوئی دھار چھُوتا ہو اُپنی تلوار کی
آپ سے کیوں کر کہیں ہندوستاں پُر ہول ہے
آپ کا نام آگ ہے اور کانگریس پٹرول ہے
وہ سُرنگیں کھُد رہی ہیں الحفیظ و الاَماں
صرف اِنگلستان کیا، یُورپ سما جائے جہاں!
نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی
صاف آتی ہے صدا چلتی ہُوئی تلوار کی
آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عُود کی
ہندیوں کی سانس سے آتی ہے بُو بارُود کی
غور سے سُن لیجئے اے خواجۂ عالی نژاد
آپ کو دھوکے میں رکھ سکتے نہیں ہم خانہ زاد

کیجئے درماں میں عُجلت، ورنہ دِل ڈر جائیں گے
حاکم اپنے گھر چلے جائیں گے، ہم مر جائیں گے
چونکیئے جلدی، ہوائے تُند و گرم آنے کو ہے
ذرّہ ذرّہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

خونی بینڈ

روح بیچین ہے خاموش ہو اے فوج کے بینڈ
اِس طرح صبح کی مخمور ہواؤں میں نہ اینڈ

تجھ میں آواز ہے فولاد شکن تیروں کی
سنسناہٹ ہے لچکتی ہوئی شمشیروں کی

کتنی ماؤں کے کلیجے کی ہیں قاشیں تجھ میں
کِتنے مہپارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں

کتنی رونڈی ہوئی لاشوں کی ہے سردی تجھ میں
کتنی بیواؤں کے چہرے کی ہے زردی تجھ میں

کتنی خوابیدہ ہیں مایوس نگاہیں تجھ میں
کِتنے معصوم یتیموں کی ہیں آہیں تجھ میں

تیرا ہر راگ ہے ڈوبا ہوا چشمِ نم میں
رقصِ خونی کی دھمک ہے ترے زیر و بم میں

سِسکیاں تجھ میں ہیں غلطیدہ دلِ افگاروں کی
کروٹیں موت کی ہیں گت میں ترے تاروں کی

تیری ہر تان میں پوشیدہ ہیں لاکھوں آنسو
تیری آواز میں غلطاں ہے جوانوں کا لہو

گُم ہیں رِستے ہوئے زخموں کی بہاریں تجھ میں!
خنجروں کی ہیں مچلتی ہوئی دھاریں تجھ میں

نغمہ ہے لے میں تری خون کے فوّاروں کا
زمزمہ تجھ میں ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

تیری آواز جب احساس پہ چھا جاتی ہے
موت کے دِل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

سلام

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو

بامِ جدال و گردِ رہِ عزم کا ہے شوق
اورنگ کی ہوس ہے، نہ افسر کی آرزو

کانٹوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں
بالش کا اشتیاق، نہ بستر کی آرزو

تعویذ کیا کروں گا کہ اِن بازوؤں کو ہے
اژدر شکار قُوّتِ حیدر کی آرزو

کرنا ہے اپنے خُون میں ہم کو شناوری
تسنیم کی تڑپ ہے، نہ کوثر کی آرزو

اُس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزر و مد
دشتِ بلا میں تھی جو بہتّر کی آرزو
رنگیں مزاجیوں کا نہیں ہے محل ہنوز
دل کو ہے خونِ مرحب و عنتر کی آرزو
بادِ مراد و آبِ طرب کا نہیں ہے وقت
طوفاں کا اشتیاق ہے، صرصر کی آرزو
رقصِ پری وشان و خرامِ صبا، حرام
دل کو ہے ضربِ فاتحِ خیبر کی آرزو
ہاں عمرِ جاوداں کی ہمیں بھی نوید دے
اے موت، اے جوانیٔ اکبر کی آرزو
جوشؔ اُس سبوئے قلب پہ کون و مکاں نثار
غلطاں ہو جس میں ساقیٔ کوثر کی آرزو

حادثے

وائے بر تقدیرِ آدم، وائے بر لیل و نہار
بزمِ عشرت بھی ہے خونی حادثوں کی رہگذار

کچھ تو ناقص حادثے ہیں کچھ مکمّل حادثے
زندگی ہیں حادثے ہیں، اور مُسلسل حادثے

سنگِ خارا کے مساکن ہوں کہ آہن کے دیار
حادثوں کے واسطے ہیں آبگینوں کے حصار

گاہ اُترتے ہیں یہاں عرشِ بریں سے حادثے
گاہ اُبل پڑتے ہیں خود فرشِ زمیں سے حادثے

دامنِ کہسار میں چلتی ہے جب بادِ شمال
حادثے اُس وقت بھی ہوتے ہیں مصروفِ قتال
جام میں ہوتا ہے جب پرتو فگن ماہِ مُنیر
حادثے کے اُس سُہانے وقت بھی چلتے ہیں تیر
جب ہوائیں گُنگُنا اُٹھتی ہیں، اور کِھلتے ہیں پھُول!
اُن مَواقع پر بھی ہوتا ہے حَوادِث کا نزُول
کچھ محُرّم ہی نہیں ہے منزلِ شِمر و یزید
ڈُوب سکتی ہے لہُو کی سُرخیوں میں صُبحِ عید
دِل کو وقتِ خواب بھی بیدار رہنا چاہیئے
حادثوں کے واسطے طیّار رہنا چاہیئے

افکار

نقاد

پیامِ آسودگی

ہم لوگ

مشاہدات

مولوی

داغِ جگر بیچتا ہوں

پروپیگنڈا

پیمبرانہ بددعا

انگیٹھی

ظلمتیں

روشنیاں

فریبِ ہستی

نقّاد

رحم اے نقّادِ فن! یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو

شاعری اور منطقی بحثیں یہ کیسا قتلِ عام
پُرسش مقراض کا دیتا ہے زُلفوں کو پیام

کیوں اُٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کیلئے؟
کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے چکھنے کیلئے؟

اے ادب ناآشنا! یہ بھی نہیں تجھکو خیال
ننگ ہے بزمِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال

منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دلپذیر
کاش اس نکتہ کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر

یعنی اِک لے سے لبِ ناقد کو کھُلنا چاہیئے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تُلنا چاہیئے

شعر فہمی کے لئے ہیں جو شرائط بے خبر
سوچ، تُو پُورا اُترتا بھی ہے اس معیار پر؟

جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا تونے داغ؟
آنچ سے جسکی غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ؟

دل سے اپنے پُوچھ او زندانیٔ علمِ کتاب
حُسنِ قُدرت کو بھی دیکھا ہے برافگندہ نقاب؟

تو پتا اسرارِ ہستی کا لگاتا ہے کبھی؟
عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی؟

کیا وہاں بھی اُڑ کے پہنچا ہے کبھی اے نکتہ چیں؟
کانپتا ہے جس فضا میں شہپرِ رُوح الامیں

خامشی کی نغمہ ریزی پر بھی سر دھنتا ہے تو؟
قلبِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے تو؟

اُن بُتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب؟
خاک کو پرچھائیاں جن کی بناتی ہیں گلاب

جو تبسّم چھین لیتے ہیں شبِ مہتاب سے
جن کی برنائی جگاتی ہے دلوں کو خواب سے

سچ بتا تو بھی ہے کیا، اے کشتۂ صد حرص و آز
رازدانِ کاکلِ شبرنگ و چشمِ نیم باز

تیری نبضوں میں بھی مچلی ہے کبھی بجلی کی رَو؟
سوزِ غم سے تیرا دل بھی کیا کبھی دیتا ہے لَو؟

سچ بتا، اے عاشقِ دیرینۂ فکرِ معاش
زہر میں تریاق کے عنصر کی بھی کی ہے تلاش؟

مجھ سے آنکھیں تو ملا اے دشمنِ سوز و گداز
تجھ پہ کیا اضداد کی توحید کا افشا ہے راز؟

تیری راتوں کی سیاہی میں بھی اے ظلمت مآب
کیا کبھی طالع ہوا ہے مسکرا کر آفتاب؟

تو گیا بھی ہے نگارِ غم کی محمل کے قریب؟
آنچ سی محسوس ہوتی ہے کبھی دل کے قریب؟

طورِ معنی پر بھی اے نافہم چڑھ سکتا ہے تو؟
کیا مصنّف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو؟

یہ نہیں تو پھیر لے آنکھیں یہ جلوہ اور ہے
تیری دنیا اور ہے، شاعر کی دنیا اور ہے

شعر کی تحلیل سے پہلے مری تقریر سن
خود زبانِ شعر سے آ شعر کی تفسیر سن

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بےشمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار

ڈھال لیتی ہے جنہیں شاعر کی ترکیبِ ادب ڈھل کے گو وہ "گوہرِ غلطاں" کا پاتی ہیں لقب
اور ہوتی ہیں تجلی بخشِ تاجِ زرفشاں پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں

جن کے اسرارِ درخشاں رُوح کی محفل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں

شاعری کا خانماں ہے نطق کا لُوٹا ہوا اُس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر
جاگتے رہتے ہیں دل کی محفلِ خاموش میں بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کے آغوش میں
لوگ جن کی جانگدازی سے ہیں دل تڑپے ہوئے کھو کھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے
شعر ہو جاتا ہے صرف اِک جنبشِ لب سے نڈھال سانس کی گرمی سے پڑ جاتا ہے اس شیشے میں بال
جام میں آتے ہی اُڑ جاتی ہے شاعر کی شراب ٹوٹ جاتا ہے کنارے آتے آتے یہ حباب

اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات

"شعر" کیا جذبِ دلِ کا ایک نقشِ ناتمام "مشتبہ سا اک اشارہ" ایک مبہم سا کلام
کیف میں اک "لغزشِ پا" کلکِ گوہر بار کی "اضطراری ایک جنبش سی" لبِ گفتار کی

"ایک صوتِ خستہ و موہومِ سازِ ذوق کی" — "مرتعش سی ایک آواز" انتہائے شوق کی

"بے حقیقت نے" کے اندر "زمزمۂ داوٗد" کا — "عارضِ محدود" پر اک عکس "لامحدود" کا

"شعر" کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال — "شعر" کیا ہے؟ عشق و حکمت کا مقامِ اتصال

"ظلمتِ ابہام میں پرچھائیں تفصیلات کی" — "پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرّات کی"

"جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں" — "ٹوٹنا رنگیں ستارہ کا اندھیری رات میں"

"شعر" کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ لحنِ دلنشیں — "شعر" کیا؟ ہر چیز کہہ کر، کچھ نہ کہنے کا یقیں

"شعر" کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا" — "برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا"

"بے زبانی اور خاموشی کی مبہم گفتگو" — "لفظ و معنیٰ میں توازن کی نہفتہ آرزو"

"بادلوں سے ماہِ نو کی اک اچٹتی سی ضیا" — "جھانکنا قطرہ کے روزن سے عروسِ بحر کا"

مر کے بھی تو، شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں، یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں

تو سمجھتا تھا، جو کہنا چاہیئے تھا، کہہ گیا — پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ سکا کیا رہ گیا

کون سمجھے "شعر" یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے، ویسے نہیں

پیامِ آسُودگی

کل صُبح، صحنِ باغ میں اِک شاعرِ صبُور
کہتا تھا یُوں کہ سینۂ ظلمت ہے گنجِ نور

مرہم کا اہتمام ہے ہر زخم کی خلش!
درماں کا ساز و برگ ہے ہر درد کا وفُور

ہر آہِ دل خراش ہے ہمرشتۂ نشاط
ہر اشکِ لالہ رنگ ہے سرمایۂ سرُور

غُربت کے دَور میں ہے نہاں موسمِ وطن
غیبت کے ساز میں ہے تپاں نغمۂ حضُور

ہر خارزارِ بیم ہے پیغمبرِ اُمید
ہر وادیٔ سیاہ ہے پروردگارِ طُور

بیدادِ زندگی سے اگر دردمند ہے
آسُودہ رہ کہ داد ملے گی تجھے ضرُور

ہم لوگ

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ
مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ

ہر ایک سانس ہے گو صد ہزار حشر بدوش
مگر پیامِ ثبات و قرار ہیں ہم لوگ

جلال چھو نہیں سکتا ہے باد و باراں کا
وہ دستِ غیب کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ

زمیں سے کرتے ہیں ناز اور آسماں سے غرور
وہ کبرِ دوست کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ

عیاں ہیں جن پہ تہی دستیاں سلاطیں کی
لباسِ فقر میں وہ شہر یار ہیں ہم لوگ

جہاں میں ہیں مگر اہلِ جہاں سے کام نہیں
وطن میں رہ کے غریب الدیار ہیں ہم لوگ

کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار ہمیں
مثالِ جوئے رواں بے قرار ہیں ہم لوگ

جوانیوں کو ہمیں سے ملی ہے نعمتِ ناز
وہ رازِ طرۂ زلفِ نگار ہیں ہم لوگ

فسردۂ غمِ ہستی سے کھینچتے ہیں شراب
بساطِ عیش پہ وہ بادہ خوار ہیں ہم لوگ

چمن میں سنتے ہیں ہر صبح نغمۂ الہام
امینِ زمزمۂ شاخسار ہیں ہم لوگ

جگر ہے وقت کا اپنی جناب میں صد چاک
وہ فاتحِ غمِ لیل و نہار ہیں ہم لوگ

حیات و موت کی پست و بلند راہوں میں
خرامِ ابر سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ

نفس میں سنتے ہیں آہٹ کسی کے قدموں کی
نہ پوچھ، کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

وہ جبرِ دوست جسے "اختیار" کہتے ہیں
اِس اختیار سے بے اختیار ہیں ہم لوگ

محیطِ سکّہ مقلوب کے طلاطم میں
سفینۂ زرِ کامل عیار ہیں ہم لوگ

حیات کی ابدی رات کے اندھیرے میں
چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہیں ہم لوگ

بجھے پڑے ہیں زمانہ کے ہات سے ہر چند
مگر پیمبرِ برق و شرار ہیں ہم لوگ

ادب سے آؤ ہمارے حضورِ اہلِ نظر
جہانِ حُسن کے پروردگار ہیں ہم لوگ

نگاہ روبرو، اے روحِ نعمت و ارین
بہ ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

بس اس خطا پہ کہ ہیں محرم رموزِ حیات
شکارِ کشمکشِ روزگار ہیں ہم لوگ

مشاہدات

ہر نفس، یہ کس کے جلووں کی خبر پاتا ہوں میں
شکر کے سجدوں میں بینائی کا سر پاتا ہوں میں

منظرِ ہستی پہ تابندہ یہ ہے کس کا جمال؟
خیرہ پہنائے دو عالم کی نظر پاتا ہوں میں

سامنے آتی ہیں جب صبحیں برافگندہ نقاب
دل میں یہ کس کے تبسّم کا اثر پاتا ہوں میں

ہر کلی میں دیکھتا ہوں ایک چشمِ نیم باز
ہر چمن کو اک بہشتِ مختصر پاتا ہوں میں

ایک اک پتّہ ہے مکتوبِ عروسِ رنگ و بو
باغ میں ہر شاخ کو پیغامبر پاتا ہوں میں

چرخ پہ ایک ایک تارے میں جھلکتا ہے جمال
خاک کے ایک ایک ذرّے میں نظر پاتا ہوں میں

نقطہ ہائے نور پر ہیں تیرگی کے دائرے
ظلمتوں میں گردشِ شمس و قمر پاتا ہوں میں

خاک کے تودوں پہ ہے معمارِ عالم کی نگاہ
ہر قدم پر ساز و برگِ بام و در پاتا ہوں میں

کانپنے لگتے ہیں جب تارے بساطِ چرخ پر
عالمِ اسباب کو زیر و زبر پاتا ہوں میں

ناخنِ غم چھیڑتا ہے جب رگِ جاں کا ستار
دل میں لیلائے طرب کو جلوہ گر پاتا ہوں میں

جلوہ گاہِ ناز میں جس وقت رکھتا ہوں قدم
اس کرہ کو حلقۂ بیرونِ در پاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں جس قدر گہری نظر سے بار بار
حسن کو پہلے سے کچھ پاکیزہ تر پاتا ہوں میں

ہر نظر رُخ پہ دکھاتی ہے اک آب و تابِ نو
ہر نفس جلووں میں اِک شانِ دگر پاتا ہوں میں

ثبت ہے تصویر کے رُخ پر مصوّر کا جمال
آئینے میں جلوۂ آئینہ گر پاتا ہوں میں

دوڑتا ہے نبضِ خس میں برقِ سوزاں کا لہو
سینۂ شبنم میں طوفانِ شرر پاتا ہوں میں

اشتیاقِ اوج میں ہیں نا تراشیدہ صنم
پتھروں میں جنبشِ صد بال و پر پاتا ہوں میں

ناخنِ حکمت پہ کرتا ہوں بھروسا جس قدر
عقدۂ اسرار کو پیچیدہ تر پاتا ہوں میں

تہ میں کیا جلوے ہیں ان کی شرح تو ممکن نہیں
سطحِ دریا پر بھی اِک موجِ گہر پاتا ہوں میں

دل میں جب آتا ہے صانع کے مصالح کا خیال
عیب کی فطرت کو لبریزِ ہنر پاتا ہوں میں

بستۂ یک آرزوئے مشترک ہے کائنات
کس قدر اضداد کو شیر و شکر پاتا ہوں میں

راہِ حق ہی میں نہیں ہیں حسن کے نقشِ قدم
گمرہی کو بھی کسی کی رہ گذر پاتا ہوں میں

پھر تعجب کیا کہ اس تر دامنی کے باوجود
جوشؔ کو منجملۂ اہلِ نظر پاتا ہوں میں

مولوی

ہوئی اِک مولوی سے کل ملاقات
شبیہِ قبّہ و تصویرِ منبر
وہی، ہوں گے جو فردوسِ بریں میں
خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر
عمامہ بر سر و مسواک در جیب
اُٹنگا پائجامہ، دلق در بر
حنا سے ریش سُرخ، آنکھوں میں سُرمہ
لٹیں مہکی ہوئی، زلفیں معطّر
جھکے شانے پہ چوخانے کا رومال
عبا کے بند میں تسبیحِ احمر
کشادہ صدر، اور کوتاہ گردن
شکم پُر رعب، قد رشکِ صنوبر
لٹیں بکھری ہوئی، آنکھوں پہ عینک
لبیں ترشی ہوئی، داڑھی شکم پر
عبا عنّاب گوں، دھانی عمامہ
گلوری منہ میں، لب خونِ کبوتر
جبیں کا داغ، اِک دہکی ہوئی رات
کمر کا گھیر، اک سمٹا سمندر

بُتوں کی چاہ میں ہم رشکِ مجنوں — خُدا کے عشق میں، وہ دیو پیکر
وضو کے فیض سے شاداب داڑھی — خُدا کے خوف سے چہرہ "گلِ تر"
سجودِ بے ریا، ماتھے کی بندی — درودِ با صفا، ہونٹوں کا پوڈر
اوامر کی ثنا، ہجو نواہی — حدیثیں بر زباں، قرآن ازبر
ارم کے تذکرے کس کس مزے سے — حنائی ریش، مٹھی میں پکڑ کر
جبیں گہوارۂ انوارِ یزداں — زباں، آئینۂ خلقِ پیمبر

مگر آنکھوں میں ہنگامِ تبسّم
ریا کی چشمکیں، اللہ اکبر

داغِ جگر بیچتا ہُوں

لئیموں میں داغِ جگر بیچتا ہُوں
بہ نرخِ خزف تاجِ زر بیچتا ہوں

جہاں سنگریزوں پہ گرتے ہیں گاہک
وہاں جنس لعل و گہر بیچتا ہوں

جہاں قدرداں جمع ہیں تلخیوں کے
وہاں قند و شہد و شکر بیچتا ہُوں

جہاں خار و خس کی خریداریاں ہیں
وہاں موجِ گلہائے تر بیچتا ہوں

پرستاریاں ہیں جہاں ظلمتوں کی
وہاں نورِ شمس و قمر بیچتا ہوں

جہاں دردِ دل کا مخالف ہے عالم
وہاں دردِ دل کا اثر بیچتا ہوں

جہاں جستجوئے سکونِ حضر ہے
وہاں آرزوئے سفر بیچتا ہوں

جہاں سات پردوں میں رہتی ہے جرأت
وہاں جذبۂ پردہ در بیچتا ہوں

جہاں پستیٔ بام و در ہے گوارا
وہاں رفعتِ بام و در بیچتا ہوں

جہاں ہر کبوتر ہے قانع قفس میں
وہاں دولتِ بال و پر بیچتا ہوں

جہاں برف و شبنم سے وابستگی ہے — وہاں فرقِ برق و شرر بیچتا ہوں
جہاں دست و پا شل ہیں پسپائیوں سے — وہاں تیغِ فتح و ظفر بیچتا ہوں
جہاں ترکِ یک مُو بھی ممکن نہیں ہے — وہاں خواہشِ ترکِ سر بیچتا ہوں
جہاں اُنس ہے تنگ دامانیوں سے — وہاں وسعتِ بحر و بر بیچتا ہوں
چھُپا کر ردیف و قوافی کے اندر — میں دل بیچتا ہوں، جگر بیچتا ہوں
گدا ہوں، مگر وہ گدائے غنی دل — کہ تاج و کلاہ و کمر بیچتا ہوں
صدا دو کہ بازارِ نوعِ بشر میں — تمنّائے روحِ بشر بیچتا ہوں
نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت — کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں
کوئی مُشتری ہو تو آواز دیدے — میں کمبخت جنسِ ہُنر بیچتا ہوں

سخن کے ہیں یوں تو بہت جوشؔ تاجر
مگر میں، برنگِ دگر بیچتا ہوں

پروپیگنڈا

وہ جھوٹ بار بار جو بولا گیا ہے آج
اس وقت جس کے نام سے ہوتا ہے اختلاج

حق کی قلیل فوج سے کرتا رہے گا جنگ
بھرتا رہے گا ریب میں ربّانیت کا رنگ

ڈھلتا رہے گا قالبِ صوت و کلام میں
چھپتا رہے گا مطبعِ تبلیغ عام میں

دائم رہے گا گرمِ سفر ایک حال پر
مخلوق کی حدیث و روایت کی تال پر

کھوتا رہے گا اپنی ضلالت گزیدگی
پاتا رہے گا شام و سحر سے رسیدگی

آتا رہے گا اہلِ جہاں کی زبان پر
چڑھتا رہے گا نشر و اشاعت کی سان پر

پکتا رہے گا ذہن کے مطبخ میں صبح و شام
گاتا رہے گا سائنس کی لَے پہ بہ التزام

بنتا رہے گا موجۂ تکرار میں گہر
سِنکتا رہے گا حرف و حکایت کی آنچ پر

چڑھتا رہے گا اوجِ نظر پر بصد حشم
کاندھے پہ ماہ و سال کے رکھتا ہوا قدم
گاتا رہے گا وہم کی بزمِ سرود میں
پلٹا رہے گا وقت کی نادیدہ گود میں
پیتا رہے گا جائزہ نزدیک و دُور کا
پیتا رہے گا دُودھ سنین و شہور کا
دامانِ عقل و جیبِ نظر پھاڑتا ہُوا
ذہنوں کی رفعتوں پہ علم گاڑتا ہُوا
تا آنکہ ایک روز وہی ناسزا دروغ
حاصل کرے گا حلقۂ عالم میں وہ فروغ

اُس جھوٹ کو صداقتِ اعلیٰ کہیں گے لوگ
آفاق کی حقیقتِ کبریٰ کہیں گے لوگ!

پیمبرانہ بد دُعا

جو بن پڑے گا، تو سب سے بڑی سزا دُوں گا
زمانہ ساز! تجھے میں یہ بد دُعا دُوں گا

ملے نہ آتشِ دوزخ کی تجھ کو نرم سزا
ملے وہ سوز جو ہوتا ہے شاعروں کو عطا

رموزِ دہر سے بڑھ جائے رسم و راہ تری
جبینِ زیست پہ پڑنے لگے نگاہ تری

تجھے حقائقِ ہستی کا کھولنا آجائے
کلی کو خار کے کانٹے پہ تولنا آجائے

عدو پہ بھی تری فطرت شفیق ہو جائے
ترے خمیر کا لوہا رقیق ہو جائے

دماغ، سرحدِ قُدرت سے متصل ہو جائے
ہر ایک ذرّہ ناچیز، جزوِ دل ہو جائے

وہ طبع سخت میں پیدا ہو انقلابِ عظیم
کہ تیرے قلب میں چبھنے لگے گلوں کی شمیم

ترے دیار میں طوفانِ آرزو آجائے
ترا ضمیر، محبّت کے روبرو آجائے

نہ بہرہ ور ہو کبھی مرگِ ناگہانی سے
خدا دوچار کرے طولِ زندگانی سے

درِ حیات، تری چشمِ دل پہ وا ہو جائے
نظر مآلِ تبسّم سے آشنا ہو جائے

بلائے قہرِ خدا تجھ کو دیدہ ور کر دے
لطیف کر کے حسوں کو لطیف تر کر دے

انگیٹھی

۱۹۲۸ء

بچپن کی اے اُداس انگیٹھی! خدا گواہ   کیا کہیے تجھ پر آج پڑی کس طرح نگاہ
تو، اور خاکِ سرد پہ یوں مثلِ سوگوار   افسوس اے زمانۂ طفلی کی یادگار
میری ہی طرح کیا ترا پہلو بھی سرد ہے؟   کیا تیرے آئینے پہ بھی ماضی کی گرد ہے؟
افسوس وہ نشاط کے موسم وہ زمزمے   جاڑوں کی دلفریب وہ راتیں، وہ چہچہے
شعلوں سے تیرے ہائے وہ اُٹھتا ہوا دھواں   وہ قہقہوں کی گونج وہ شیریں پہیلیاں
خوشبو وہ تیری آنچ کی، جاں بخش و دل نواز   وہ تیرگی میں رنگ ترا، دل میں جیسے راز

شعلے وہ سُرخ سُرخ، دلوں میں تُلے ہوئے
وہ سُرخیوں میں نرم تبسّم گھُلے ہوئے

شعلوں کے بار بار وہ اندازِ دل نشیں
دَم بھر میں زرنگار، تو دم بھر میں سُرمگیں

ڈوبی ہوئی حیات میں تیری وہ گرمیاں
وہ گرمیوں میں لُطف کے قصّوں کی نرمیاں

وہ سادگی کی بزم میں بجتے ہوئے ستار
کلیوں کا کوٹلوں کی چٹکنا وہ بار بار

وہ غنچگی کا عہد، وہ گل باریاں تری
اُڑتی ہوئی ہوا میں وہ چنگاریاں تری

وہ نرم نرم جسم، وہ تیری حرارتیں
وہ ذمّہ داریوں سے مُعرّا شرارتیں

وہ چھوکرے، ادب سے دروں میں کھڑے ہوئے
دایاؤں کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے

ماماؤں کی صفوں میں وہ مُغلانیوں کی شان
رکھّا ہوا وہ تخت پہ چاندی کا پاندان

وہ تیرے گرد و پیش، بصد شانِ افتخار
آواز پاندان کے کھُلنے کی بار بار

شایانِ آفریں و خواتین کا شعار
شوخی کے رنگ میں بھی وہ اک نوع کا وقار

وہ ہیکلیں گلوں میں، لبوں پہ وہ لالیاں
ہلتی ہوئی وہ کانوں میں سونے کی بالیاں

وہ لونڈیوں کے رُخ پہ نشاں خاک دھول کے
جوڑے وہ اُونچے اُونچے، وہ مُوباف تول کے

وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھٹے ہوئے
رُعب آفریں دروں میں وہ پردے چھُٹے ہوئے

وہ نچلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار
پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار

ہلکی رضائیوں کی وہ افسانہ باریاں
اطلس کی سُرخ گوٹ پہ وہ سُرخ دھاریاں

وہ "ایک بادشاہ" کی بیٹی کا ذکرِ خیر
وہ ولولے جنوں کے، وہ پریوں کا شوقِ سیر

وہ مرحمت ہیں غرق بڑی بوڑھیوں کی ذات
وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ

وہ اِک عجیب شانِ طرب سے ملی ہوئی
شیریں حکایتوں میں سرودوں کی راگنی

کیوں؟ اب بھی یاد ہیں وہ لڑکپن کے زمزمے؟
اے شمعِ خوابگاہِ فراغت جواب دے

جن کو بھلا رہی ہیں ہماری جوانیاں
اب اُن میں تجکو یاد ہیں کتنی کہانیاں!

ظلمتیں

تیرگی لپٹی ہوئی ہے دہر میں ہر ضو کے ساتھ عربدہ کرتا ہے یاں ہر راستہ رہرو کے ساتھ

لعلِ شیریں کے تبسم میں ہے غلطاں آہِ سرد ظلمتوں کی وحی ہے قندیلِ زر کی لو کے ساتھ

ہم نفس! پایاں ہے ہر رعنائی و افسوں گری بیوگی کا دبدبہ بھی ہے عروسِ نو کے ساتھ

اس قدر بھی ناز فرماتا ہے کوئی اے چمن دھوپ بھی ہے ابرِ رنگا رنگ کے پرتو کے ساتھ

حسنِ شیریں و غرورِ تاج کے ہوتے ہوئے تیشۂ فرہاد کا دھڑکا بھی ہے خسرو کے ساتھ

انجمن میں رات کو چپکے سے پا جاتا ہے بار فتنۂ ظلمت نشاں بھی روشنی کی رو کے ساتھ

ڈوب جاتا ہے تڑپ کر سینۂ دریا میں جوش
سوزِ پیچ و تاب بھی تنویرِ ماہِ نو کے ساتھ

روشنیاں

صرف ظلمت ہی نہیں ہے دیکھ تنویریں بھی ہیں
کاوشِ تخریب کی ہلچل میں تعمیریں بھی ہیں

جس جگہ خورشید کی حدّت سے ہے عالم خموش
واں کسی دیوار کے سایہ میں تقریریں بھی ہیں

جس جگہ مایوسیاں ہیں گردشِ تقدیر سے
واں کہیں اُمید کی پوشیدہ تدبیریں بھی ہیں

جس جگہ ژولیدہ عقدوں سے ہیں عقلیں سرنگوں
واں حیات و مرگ کی تابندہ تفسیریں بھی ہیں

جس جگہ منڈلا رہے ہیں مبہم و تاریک خواب
واں کسی گوشہ میں ان خوابوں کی تعبیریں بھی ہیں

جس جگہ تعزیر کے شایاں ہے ذوقِ نقش و رنگ
واں کہیں آئینوں میں رنگین تصویریں بھی ہیں

جس جگہ پانی میں ہے زہرِ ہلاہل کا اثر
واں ہوا میں چشمۂ حیواں کی تاثیریں بھی ہیں

جس جگہ دوڑی ہوئی ہیں سنگِ خارا کی رگیں
واں درخشاں جوہروں کی نرم تحریریں بھی ہیں

ٹوٹتا ہے سلسلہ کب زلفِ عنبر بیز کا
میں نے مانا طوق بھی ہے جوش زنجیریں بھی ہیں

فریبِ ہستی

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی
کہ گھُٹ کے آرزوئے تخمِ گُل نہ رہنے پائے
مِٹا کے نقشِ دُوئی، صیدِ رنگ و بُو کے لئے
مہین جال سے بُن کر زمیں کی تہ میں بچھائے
کثافتوں میں لطافت کی شمع روشن کی
نمُو کی ظُلمتِ افسردہ میں چراغ جلائے
گھٹا کی جیب تراشی، فضا پہ ڈالے دام
قدم پہ شمس کے تڑپی، قمر کے ناز اُٹھائے

گزشتہ زہرہ جبینوں کے دِلنشیں ذرّات
نفس کی لَو پہ بڑے اہتمام سے پگھلائے
جمالِ خاک نشیں کو دکھائی راہِ فلک
جمُودِ زیرِ زمیں کو تپش کے راز بتائے
تری زمین سے لی، آسمان سے گرمی!
صبا سے عطر نچوڑا کرن سے رنگ چرُائے
بھگو کے رنگ میں ذرّات کی بنائی تہیں!
اَور اُن تہوں میں تکلّف کے ساتھ نقش بنائے
گرہ لگائی پھر اِک، مثلِ نرگسِ مخمُور
اور اس طرح کہ ہواؤں کی رَو میں کھُلتی جائے
اور اِن تمام مراحل کے بعد ایک کلی
چمن فروز ہوُئی پتّیوں سے مُنہ کو چھُپائے
سحر کے وقت بالآخر کِھلی، گلاب بنی
مشامِ جاں کو کیا مست، بوستاں مہکائے

اور اس کے بعد جو دیکھا غروب کے ہنگام
پڑی ہوئی تھی سرِ خاک ناوکِ غم کھائے
یہ کیا نظام ہے معبود! بزمِ ہستی کا؟
کھلے جو صبح کو، وقتِ غروب کمھلا جائے
جو ایک پل میں ہو تعمیرِ ماہ و سال خراب
تو کس امید پہ کوئی فریبِ ہستی کھائے
"بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد است
بیار بادہ کہ بنیادِ عمر بر باد است" (حافظ)

رنگ و بُو

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کیلئے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صُبح کافی تھی

گریۂ مسرت

آواز کی سیڑھیاں

ساون کے مہینے

گھٹا

آیئنے

بدلی کا چاند

البیلی صبح

نغمۂ سحر

صبوحی

یومِ بہار

برسات کی ایک شام

آج کی رات

برسات کی چاندنی

شام کا دامان

گریۂ مسرت

آج تڑکے "الحفیظ والاماں" — دوستو! عثمان ساگر[1] کا سماں
دیدنی تھی نرم پودوں کی لچک — بدلیاں چھائی ہوئی تھیں دور تک
ظلمتیں تھیں نور سے گرمِ ستیز — ولولوں پر تھی ہوائے تند تیز
سامنے تھیں پتھروں کی حسرتیں — نرم و نازک جھاڑیوں کی شکل میں
جزر و مد میں تھی بلفظِ اضطراب — ساغرِ عثمان ساگر کی شراب
روحِ طوفاں در بغل، کف در دہاں — لو سنو کس طرح تھیں موجیں رواں
جھاگ اڑاتی، پھاندتی، اڑتی ہوئی — کپکپاتی، لوٹتی، مڑتی ہوئی!
چلبلی، ابھری ہوئی، نکھری ہوئی — چیختی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی
بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی — دمبدم آتی ہوئی، جاتی ہوئی
اس طرف سے اس طرف ہٹتی ہوئی — پتھروں کو چھانٹتی، دھوتی ہوئی
گرتی پڑتی، مست سر دھنتی ہوئی — مرتعش قالین سا بنتی ہوئی
زیر و بم کا تار دکھلاتی ہوئی — اٹھ کے بڑھتی، گر کے چکراتی ہوئی

[1] حیدرآباد کا ایک فرح پرور تالاب۔

گنگناتی، صف بصف آتی ہوئی　　لڑتی بھڑتی، گونجتی، گاتی ہوئی
مچھلیوں کو درسِ غم دیتی ہوئی　　ہچکیوں پر ہچکیاں لیتی ہوئی
ساحلِ رنگیں سے ٹکراتی ہوئی　　اینڈتی، اٹھلاتی، بل کھاتی ہوئی
دمبدم ہنستی ہوئی، روتی ہوئی　　ملتی، کتراتی، جدا ہوتی ہوئی
جابجا دلدل میں کاجل پارتی　　چوکڑی بھرتی چھلانگیں مارتی
پے بہ پے غاروں کے اندر گھومتی　　ناچتی حلقے بناتی جھومتی
بلبلاتی، بھاگتی، منہ موڑتی　　مڑ کے پھر ساحل پہ موتی توڑتی
گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی　　دوڑتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی

تو کہے دریا میں تھا غرقِ نمو
یار کی کڑیل جوانی کا لہو

یہ سماں تھا، اور اک رنگیں پرند　　روحِ شاعر کی طرح بے قید و بند
بے خودی کے جام چھلکاتا ہوا　　گزرا میرے پاس سے گاتا ہوا

نغمہ سن کر اس قدر جی خوش ہوا
ہچکیاں لے لے کے میں رونے لگا

آواز کی سیڑھیاں

کل جھٹپٹے کے وقت کہ تھا زرد آفتاب! — چھایا ہوا تھا عرصۂ ہستی پہ رنگِ خواب
ظلمت کی بڑھ رہی تھی لگاوٹ فضا کے ساتھ — اک راگنی سی کھیل رہی تھی ہوا کے ساتھ
ہر سانس پر شفق کا گریباں تھا چاک چاک — تھا اِک خلا سا، وقت کے سینے میں ہولناک

اِتنے میں آئی بن کے صدائے طیور سے
بن کے کسی نگار کی اک تان دور سے

بے صرفہ جستجو کی کہانی لئے ہوئے — اِک نو اسیرِ غم کی جوانی لئے ہوئے
نا آزمودہ غم کی جبیں چومتی ہوئی — تپتی ہوئی، لرزتی ہوئی، جھومتی ہوئی
بیگانہ رسمِ عیش کی فکرِ فضول سے — ملتی ہوئی غروب کی یادِ ملول سے
روتا ہوا سکوتِ لبِ جو لئے ہوئے — دوشِ صدا پہ عشق کے آنسو لئے ہوئے

کچھ سُرخیٔ شفق میں سیاہی سی آگئی
میداں پہ اک اداس خموشی سی چھاگئی

ویرانہ فرطِ درد سے غمناک ہو گیا　　اتنے میں کچھ ٹھہر کے پھر آئی وہی صدا

نغمے کی نبضِ سرد مکرّر تپاں ہوئی

گویا ٹھہر کے موج دوبارہ رواں ہوئی

پھر اس کے بعد تیز ہوئی تان دفعتہً　　اللہ رے زور، گونج اُٹھا گنبدِ کہن

اور اُس کے بعد لحن کا دامن سمٹ گیا

اور یُوں صدا کا زور بتدریج گھٹ گیا

گویا سفید، دُودھ سی، پتھّر کی سیڑھیاں　　پتلی، سُبک، خنک، متناسب، گہر فشاں

تیشے سے زیر و بم کے ترش کر سنور گئیں

ساحل سے تا بہ نہر مچلتی اُتر گئیں

ساون کے مہینے

فردوس بناتے مرے ساون کے مہینے — اِک گل رُخ و نسریں بدن و سروِ سہی نے
ماتھے پہ ادھر کاکلِ ژولیدہ کی لہریں — گردوں پہ اُدھر ابرِ خراماں کے سفینے
مینہ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار — اُتنے ہی زمیں اپنے اُگلتی تھی دفینے
اللہ رے یہ فرمان کہ اس مست ہوا میں — ہم مُنہ سے نہ بولیں گے، اگر پی نہ کسی نے
وہ مونس و غمخوار تھا جس کیلئے برسوں — مانگی تھیں دُعائیں مرے آغوشِ تہی نے
گُل ریز تھے ساحل کے لچکتے ہُوئے پودے — گلرنگ تھے تالاب کے ترشے ہوئے زینے
بارش تھی لگاتار تو یوں گرد تھی مفقود — جس طرح مئے ناب سے دُھل جاتے ہیں کینے
دم بھر کو بھی تھمتی تھیں اگر سرد ہوائیں — آتے تھے جوانی کو پسینے پہ پسینے

بھر دی تھی چٹانوں میں بھی غنچوں کی سی نرمی　　اک فتنۂ کوہ بن کی نازک بدنی نے

گیتی سے اُبلتے تھے تمنّا کے سلیقے　　گردوں سے برستے تھے محبّت کے قرینے

کیا دل کی تمنّاؤں کو مربُوط کیا تھا　　سبزے پہ مچلتی ہوئی ساون کی جھڑی نے

بدلی تھی فلک پر کہ جنُوں خیز جوانی　　بُوندیں تھیں زمیں پر کہ انگُوٹھی کے نگینے

شاخوں پہ پرندے تھے جھٹکتے ہُوئے شہپر　　لہروں میں بطیں اپنے اُبھارے ہوئے سینے

اس فصل میں اس درجہ رہا بے خود و سرشار　　مے خانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

کیا لمحۂ فانی تھا کہ مُڑ کر بھی نہ دیکھا
دی کتنی ہی آواز حیاتِ ابدی نے

گھٹا

اُٹھی گھٹا، وہ رنگ و بو کا کارواں لئے ہوئے
جلو میں کائنات کی جوانیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے پیامِ جاں، ہر ایک رس کی بوند میں
ہر ایک رس کی بوند میں پیامِ جاں لئے ہوئے

لئے ہوئے ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں
ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں لئے ہوئے

دھواں دھواں لئے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی
بلندیوں پہ چرخ کی دھواں دھواں لئے ہوئے

زمینِ تشنہ کام کی جماہیوں کے سامنے
شرابِ لالہ رنگ کی گلابیاں لئے ہوئے

وفورِ سوز و ساز میں ہجومِ پیچ و تاب سے
رقیق و نرم دامنوں میں بجلیاں لئے ہوئے

ہر ایک سو رواں دواں کبھی یہاں کبھی وہاں!
بتانِ شوخ و شنگ کی ہنسی خوشیاں لئے ہوئے

صدائے برق و رعد میں، ہوائے تند و تیز میں
نزاعِ عشق و ہوش کی کہانیاں لئے ہوئے

ہوا میں اینڈتی ہوئی فضا میں جھومتی ہوئی
تحمل و شکیب کی تباہیاں لئے ہوئے

بہشتِ حُسن و عشق کو، جہانِ رقص و کیف کو — فضائے آب و رنگ میں کشاں کشاں لئے ہُوئے
حریمِ کیف و سرخوشی میں، پردہ ہائے رنگ میں — سبُو بدوش مغبچوں کی مستیاں لئے ہُوئے
ادا و ناز و دلبری کی رنگ بیز چھاؤں میں — نئی نئی جوانیوں کی جھلکیاں لئے ہُوئے
لئے ہُوئے، ہواؤں پر سیاہ و سُرخ کشتیاں — ہوائے تُند کشتیوں کے بادباں لئے ہُوئے
لئے ہوئے بلندیوں پہ ولولے حیات کے — حیات بخش ولولے بلندیاں لئے ہُوئے
سیاہیوں کے سلسلے میں، تیرگی کی موج میں — جُنوں فروش کاکلوں کی داستاں لئے ہُوئے

کدھر ہے جوشؔ! بدلیاں رواں ہیں سُوئے میکدہ
سیاہیوں کے حاشئے پہ سُرخیاں لئے ہُوئے

آیئے

مہکے ہوئے ہوائے بہاراں میں آیئے
وقتِ سحر قریب ہے بُستاں میں آیئے

بکھرا کے رُوئے تازہ پہ شب رنگ کاکلیں
نکہت سرائے سنبل و ریحاں میں آیئے

کلیوں کو ہے غرُور تو پھُولوں کو ناز ہے
ہنستے ہُوئے ذرا چمنستاں میں آیئے

ناشُستہ عارضوں میں ہے رنگینیوں کی دُھوم
اِس گلستاں کے ساتھ گلُستاں میں آیئے

واقف نہیں ہیں جوشؔ کے رُتبے سے آپ ابھی
اِک دن تو کوئے بادہ فروشاں میں آیئے

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا
وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا اُبھر کر بادل سے وہ چاند جبیں جھلکانے لگا
لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خطے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا
بادل میں چھپا، تو کھول دیئے بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا، تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسّم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلّی دوڑ گئی، ڈوبا، تو فلک بے نور ہوا
الجھا، تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

لیلیٰ صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت، جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، اُفق کی لَو تھر تھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزلخواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیورِ بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیمِ فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے، پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مدِّ نظر ہیں کتنی رعایتیں چشمِ خوں فشاں کی!
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے
شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلّو سکھا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رَو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے؟

نغمۂ سحر

نسیم ہوتی ہے محوِ راحت، سکوت ہوتا ہے جب چمن میں
میں پیش کرتا ہوں اپنے آنسو، خنک ستاروں کی انجمن میں
مرے گلستانِ شاعری میں، لچکنے لگتی ہیں نرم شاخیں
نسیم، رقاصۂ گلستاں، ہنوز چلتی نہیں چمن میں
مجھے سنگھاتی ہیں رُوح پرور ہوائیں اُس وقت لُٹئے قدرت
شمیمِ گُلشن ہنوز ہوتی ہے بند غنچوں کے پیرہن میں
سفید ہلکی سی چاندنی میں بلند ہوتے ہیں میرے نغمے
چٹکنے والی تمام کلیاں خموش ہوتی ہیں جب چمن میں

مرا دماغِ سحر پرستی ہمیشہ اُس وقت جاگتا ہے
فلک پہ جس وقت چاند ہوتا ہے ملگجے خواب پیرہن میں
ہنوز نغموں کی خوابگاہوں کے گرد ہوتے ہیں سُرخ پردے
رباب دل کا میں چھیڑتا ہوں، حریمِ دوشیزۂ سخن میں
اِدھر ٹپکتے ہیں اشکِ سوزاں مری جھپکتی ہوئی مژہ سے
اُدھر دمکتی ہے کچھ کچھ افشاں اُفق کے گیسوئے پرشکن میں
فضا میں ہوتی نہیں ہے لرزش، خموش ہوتا ہے نُطقِ عالم
یکایک اُس وقت جاگتی ہے، زبانِ فطرت مرے دہن میں
یہ اب تو دستور ہو گیا ہے کہ جوش! کچھ رات بھیگتے ہی
سُلگنے لگتی ہے سوزِ دل سے، اِک آگ سی میرے تن بدن میں

صبوحی

اُٹھ بربط و صُراحی و مینا لئے ہوئے
رنگِ طلوعِ صبح ہے صہبا لئے ہوئے

ہر خار و خس ہے آئینہ دارِ عروسِ گُل
ہر برگِ گُل ہے عارضِ سلمیٰ لئے ہوئے

غُنچے ہیں رنگِ نرگسِ خوباں سے بہرہ یاب
جھونکے ہیں بوئے کاکلِ زیبا لئے ہوئے

شبنم کا رس، نسیم کی خُنکی، کلی کا رنگ
آئے ہیں طائرانِ دل آرا لئے ہوئے

کہتے ہیں جس کو روئے صنم کی ملاحتیں
وہ شے ہے اپنی چھاؤں میں صحرا لئے ہوئے

رُسوائیوں کا خوف ہے کیفِ شبینہ کو
انگڑائیوں کا جوش ہے دریا لئے ہوئے

پھولوں کے دل ہیں شرحِ محبت سے چاک چاک
کلیوں کے لب ہیں حرفِ تمنّا لئے ہوئے

شبنم ہے برگِ تازہ پہ، شبنم میں سُرخیاں
آ! بوستاں ہیں دیدۂ موسیٰ لئے ہوئے

اے چشمِ جوش! مژدہ، کہ لیلائے رنگ و بُو
چُٹکی میں ہے نقاب کا گوشا لئے ہوئے

یومِ بہار

اے ہمنشیں! وہ جوشِ مئے ارغواں ہے آج
صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج!

ہر مغبچہ کہ رقص کناں ہے بہ طرزِ نو
چشم و چراغِ سلسلۂ قدسیاں ہے آج

جس پہ نثار موجۂ تسنیم و سلسبیل
بکھری ہوئی وہ کاکلِ عنبر فشاں ہے آج

اللہ رے سیلِ نغمہ و طوفانِ رنگ و بو
موجِ ہوا میں جنبشِ نبضِ جواں ہے آج

شکرِ خدا کہ طرۂ طرفِ کلاہِ دوست
مشعل فروزِ مجلسِ روحانیاں ہے آج

پھر چہرۂ بشر پہ ہے رنگِ الوہیت
پھر فرشِ خاک پہ سرِ کروبیاں ہے آج

اوجِ فلک پہ موجۂ ابرِ سبک خرام
صحنِ چمن میں جلوۂ سروِ رواں ہے آج

وہ دخترِ رز کہ تھی خمِ رنگیں میں معتکف
صد شکر صدرِ انجمنِ مے کشاں ہے آج

اُف ری شمیم کاکل شب رنگ و بوئے عود
دوشِ صبا پہ دولتِ باغِ جناں ہے آج

رندوں کے ساتھ روحِ دو عالم ہے رقص میں
یومِ طوافِ کعبۂ رطلِ گراں ہے آج!

ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہِ ناز
عینُ الیقیں بہشت کا وہم گماں ہے آج

زیرنگیں زمیں ہے، قبضے میں آسماں
آفاق پر حکومتِ پیرِ مغاں ہے آج

ہر خشک و تر میں گونج رہی ہیں حکایتیں
ہر ذرّہ حقیر کے مُنہ میں زباں ہے آج

رہ رہ کے اُڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانئے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

اے جوشؔ زلزلے میں ہے قصرِ تعیّنات
دل ماورائے قیدِ زمان و مکاں ہے آج

برسات کی ایک شام

(راجپوتانہ)

خُنک ہواؤں میں اُٹھتی جوائیوں کا خرام
کنارِ دشت میں برسات کی گلابی شام
زمیں کے چہرۂ رنگیں پہ آسماں کی ترنگ
خُنک ہواؤں کی بھیگی ہُوئی تہوں کا رنگ
فلک پہ بازیٔ طفلانہ ابر پاروں کی!
ندی کے موڑ میں انگڑائیاں نگاروں کی
ہر ایک ذرّے میں ہیجان مست ہونے کا
ذرا سا ریل کی پٹری پہ رنگ سونے کا

شفق، ھلال، ندی، رنگ، ابر، سبزہ، ہوا
ہوا میں مور کی آواز، جھینگروں کی صدا
خفیف زمزمہ، امواج کی روانی میں!
فلک پہ رنگ، درختوں کے سائے پانی میں
فضا شگفتہ، گھٹا لالہ گوں، شفق چنچال
ہوا لطیف، زمیں نرم، آسماں سیّال
یہ جاں فروز مناظر، کہ دِل لبھاتے ہیں
بچھڑ گیا ہوں کسی سے تو کھائے جاتے ہیں

آج کی رات

(سنہ ۱۹۳۴ء)

دیدنی ہے مری محفل کا سماں آج کی رات
موجِ صہبا میں ہے رقصِ دو جہاں آج کی رات

لُٹ گیا ہے کوئی اس طرح گل افشانی پر
ذرّے ذرّے پہ ہے جنّت کا گماں آج کی رات

قابلِ دید ہے بکھرے ہوئے پھولوں کی بہار
ہر شکنِ فرش کی ہے کاہکشاں آج کی رات

ایک موہوم سا نقطہ ہے جہاں ارض و سما
ایسا اک دائرہ ہے رطلِ گراں آج کی رات

اثرِ مے سے ہے پگھلا ہوا سونا گویا
عرق آلودہ رُخِ سیمبراں آج کی رات

پرتوِ بادۂ روشن سے ہے بے گرد و غبار
اُفقِ عربدۂ زہرہ وشاں آج کی رات

قابلِ ظلم نہیں فطرتِ خوباں اس وقت
قادرِ جور نہیں طبعِ بتاں آج کی رات

شمع ہے قابلِ پروانۂ آشفتہ مزاج
حُسن ہے مائلِ صاحب نظراں آج کی رات

آبِ حیواں کا نہ کر ذکر کہ حاصل ہے مجھے
دولتِ قربِ مسیحا نفساں آج کی رات

جوئے کہسار کے مانند گزر عالم سے
یہ ہے فرمانِ جہانِ گزراں آج کی رات

اُف ری ساحل پہ غزلہائے رواں کی ہلچل
اک تلاطم ہے سرِ آبِ رواں آج کی رات

غلغلہ ساز کا ہے، دیرِ مغاں سے لیکر
تا بہ خلوت گہِ حورانِ جناں آج کی رات

جیسے بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک عود آمیز
نفسِ شام ہے یوں مشک فشاں آج کی رات

خادمانِ درِ ساقی کے سروں پر کج ہے
کُلہ خواجگیٔ کون و مکاں آج کی رات

حلقہ باندھے ہوئے میخوار ہیں سرگرمِ طواف
جوشؔ ہے قبلۂ رندانِ جہاں آج کی رات

برسات کی چاندنی

چرخ پر برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے جا بجا
چاندنی، تالاب، سنّاٹا، پپیہے کی صدا
دشت پر چھائے ہوئے ذوقِ جنوں کے ولولے
چاند میں معصوم بچّے کے تبسّم کی ادا
فصلِ سرما میں سحر کو غسل کر چکنے کے بعد
رنگ ہو جیسے کسی معشوق کا نکھرا ہُوا
سینۂ امواج میں سیّال چاندی کی تڑپ
طاقِ گل میں قطرۂ شبنم کا چھوٹا سا دِیا
نرم شاخوں کی لچک، سرشار ساحل کا سکوت
دشت کی خوشبو، فضا کی تازگی، ٹھنڈی ہوا

جانستاں کلیوں کے عُقدے، نُور سے سُلجھے ہُوئے
دلرُبا میداں کا دامن اوس میں ڈُوبا ہوا
موجزن ہے اتصالِ ماہ و جُوئے تُند میں
وہ طرب کا دَورِ کرب افزا، کہ تھا بھُولا ہُوا
موسمِ باراں کی رَو میں چاند شفاف و رقیق
مینہ کے چھینٹوں کے اثر سے آسماں پگھلا ہُوا
کانپتی لہروں سے اُٹھتے ہیں نمُو کے زمزمے
جھُومتے پودوں سے آتی ہے جوانی کی صدا
لرزشِ صہبا میں جھلکے جس طرح نشّے کی رُوح
چاند ہے اِس طرح قلبِ آب میں ڈُوبا ہُوا

شام کا رُومان

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں / مجھے ہر ایک پتّی نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

فضائے نرم پر جس وقت چھا جاتا ہے سنّاٹا / مجھے جنبش میں ذرّوں کی زباں معلوم ہوتی ہے

سسکتی ہے مزے سی جب گھنے جنگل کے سائے میں / ہوائے سرد میری ہم زباں معلوم ہوتی ہے

بلند و پستِ آب و رنگ جب کچھ بھی نہیں رہتا / یہ دُنیا صرف اک وہم و گماں معلوم ہوتی ہے

ٹپک پڑتا ہے جب خورشید آنسو بن کے گردوں سے / لبِ جاں پر صدائے الاماں معلوم ہوتی ہے

دلِ وادی سے اُٹھتا ہے دھُواں جس وقت ہلکا سا / پہاڑوں کی بلندی سرگراں معلوم ہوتی ہے

چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے دامن میں / بشر سے رُوحِ عالم بدگماں معلوم ہوتی ہے

جھلک اُٹھتا ہے جب پہلا ستارہ بامِ گردوں پر / کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے

فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اداسی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

شفق کو دیکھتے ہی وہ محبت جس کو جگ بیتا
مرے دکھتے ہوئے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

اندھیرے میں لبِ ساحل جو پتے کھڑکھڑاتے ہیں
مجھے گیرائیِ فصلِ خزاں معلوم ہوتی ہے

زمین و آسماں جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں رایگاں معلوم ہوتی ہے

شفق کے ہر نفس اڑتے ہوئے اوراقِ زریں میں
مجھے بیتا ہوئی عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

دیا کچھ فاصلے پر ٹمٹما اٹھتا ہے جب بن میں
سیاہی روشنی کی رازداں معلوم ہوتی ہے

ریتلی[1] ڈھال پر انگڑائی لیتا ہے اک افسانہ
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

---

[1] ریت سے "ریتیلی" کے عوض مجھے "ریتلی" زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

مُطالعہ و نظر

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفَس ذوقِ نظارہ کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

رقص

صُبحِ میکدہ

دُوری

کوہستانِ دکن کی عورتیں

سُہاگن بیوہ

جھُریّاں

کِسان

مہاجن اور مفلس

محسُوسات

رقص

ہاں اُٹھا لے رُوحِ موسیقی ربابِ زر فشاں
رقص کی تشریح پر مائل ہے شاعر کی زباں

رقص کیا ہے؟ خاک کے دل میں خروشِ کائنات
پیکرِ فانی میں گرمِ نازؔ لافانی حیات

جلوۂ محدود کے دل میں بہ ایمائے شباب
حسنِ لامحدود بن جانے کا شیریں پیچ و تاب

چاندنی میں جوئے شیریں جیسے تھم تھم کر بہے
انکھڑیوں کی شعر گوئی، ساعدوں کے زمزمے

محفلِ صورت میں لیلائے معانی کا بناؤ
چشمکِ بیباک میں سیّال نغموں کا بہاؤ

خون میں لہروں پہ لہریں لحنِ بے آواز کی
لغزشوں پر لغزشیں مشقِ خرامِ ناز کی

خیر سمجھا دوں، ذرا لانا تو مینائے شراب
رقص اس موقع پہ چہرے سے اُلٹتا ہے نقاب

جب صبا کی سنسناہٹ اور ساغر کی کھنک
قامتِ موزوں میں بنجاتی ہے ہلکی سی لچک!

رقص ہے دراصل رعنائی کا لحنِ بے خروش — قلبِ نازک میں تمنائے ہم آغوشی کا جوش
جنبشِ مژگاں کی رنگیں، مست، شیریں داستاں — عشوۂ ترکانہ کی سحر آفریں انگڑائیاں
معنیٔ بے لفظ کی شرحِ دل آویز و خموش — جرأتِ پنہاں کی بیتابی، تمنا کا خروش
خون کی گردش میں رہ رہ کر بہ رنگِ زیر و بم — حوصلوں کی بیقراری، ولولوں کا پیچ و خم
جوئے طوفاں خیز کے سانچے میں ڈھلنے کی امنگ — کھنچ کے آغوشِ تمنا میں مچلنے کی امنگ
دست و پا کے لوچ میں اُس حرفِ مبہم کا ظہور — نطق کی پرواز سے ہے آشیانہ جس کا دور
خال و خد کی نغمہ ریزی، ابروؤں کی گفتگو — نرگسِ مخمور میں طغیانِ شرحِ آرزو
جذبۂ بیدار کا پالا ہوا خوابِ گراں — جنبشِ مژگاں کی گویائی، اشاروں کی زباں
ایک ایسا ساز، مابینِ یقین و اشتباہ — پا سکے جس کو نہ کان اور سن سکے جس کو نگاہ

جوشؔ! بس خاموش ہو، پیمانہ بھرنے دے مجھے
جھوم کر بربط اٹھا اور رقص کرنے دے مجھے

صبحِ میکدہ

سنہ ۱۹۲۶ء

میخانے کو صُبح جا کے دیکھا
عالم تھا سکوتِ خواب کا سا

ہلکی سی وہ روشنی گلابی!
کہتی تھی کہاں گئے شرابی

تھیں فرش پہ سلوٹیں سی ہر سو
زانو سے مِلے تھے شب کو زانو

پیدا تھا سکوت سے ترانہ
تھی فرش کی ہر شکن فسانہ

شیشوں سے جو مے چھلک گئی تھی
رودادِ نشاط کہہ رہی تھی

کچھ نقشِ قدم جہاں بنے تھے
سجدوں کے وہیں نشاں بنے تھے

حجروں کی ہوا بسی ہوئی تھی
خُوشبو سے نئی جوانیوں کی

آتی تھی خموشیوں سے ہر بار
رقاصہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار

شیشوں کے خطوط میں بصد ناز
غلطیدہ تھی ہاؤ ہو کی آواز

گنبد میں تھی محوِ پر فشانی
اربابِ نظر کی شعر خوانی

پردوں میں مچلتی تھیں زبانیں
پھولوں میں بھری تھیں داستانیں

لہریں سی ہوا میں لے رہے تھے — ملبوس حریر و پرنیاں کے
بالائے ہوا بنے ہوئے تھے — دُزدیدہ نگاہیوں کے جادے
غنچے سے فضا میں کھل رہے تھے — نظروں کے خطُوط مل رہے تھے
آئینوں میں کچھ عیاں تھا، کچھ گم — اِک زہرہ جمال کا تبسُّم
وہ حجلۂ کیف جس میں شب بھر — تھا مطرب و مے سے ایک محشر
ہنستا ہی تھا، اور نہ رو رہا تھا — جاگا ہوا شب کا سو رہا تھا
نغمے، کہ چھڑے رہے تھے شب بھر — آسودہ تھے بام و در کے اندر
حجُرے میں تھی رات یوں سمائی — جاذب میں ہو جیسے روشنائی
یوں جذب کئے ہوئے تھے ذرّات — انفاس و تبسُّم و خیالات

ذرّوں کو کوئی فشار اگر دے
پھر منعقد ایک بزم کر دے

دُوری

یہ بُعد ہے سراسر، یہ محض فاصلہ ہے
جلووں کو جو یہاں کے رنگیں بنا رہا ہے

دُنیا کی ہر وہ صُورت دِل کو لُبھا رہی ہے
جو دُور سے تجلّی اپنی دکھا رہی ہے

ہر چند کچھ نہیں ہے افتادگی کی ہستی
جب دُور ہو زمیں سے دل کھینچتی ہے پستی

ہر دُور کی صدا میں اک دُھن ہے ایک گت ہے
اس بُعد کو نہ جانے کِس سے مُناسبت ہے

اہلِ خرد کی باتیں کب رند مانتے ہیں
راز اس کشش کا ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں

پردے میں اس کشش کے اِک پاک آرزُو ہے
انساں میں یہ خُدا کی پوشید جستجو ہے

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں اِس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے رُوپ میں

واہ کیا کہنا ترا، اے حسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب

ہر سراپا، بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اِتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سَجَل

چال جیسے تند چشمے، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں بےمثال

عورتیں ہیں، یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طُوفاں خیز پتھریلا شباب

یہ جواں چہرے، یہ چہروں میں برنائی کا جوش
تو کہ آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اسقدر ٹھوس، الحفیظ و الاماں
لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی، بٹی سی کاکلیں　　آہنِ فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں
دید کے قابل ہے اِن کافر بتوں کا رنگ روپ　　کھپ چکی ہے جسمیں بارش، ڈس چکی ہے جس کو دھوپ
اِن بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی، الاماں　　پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنہیں　　آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنہیں

کیا خبر، کتنے دِلوں کی جوشش پامالی ہوئی
اِن اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

سہاگن بیوہ

نیک تلسی داس گنگا کے کنارے وقتِ شام — جا رہا تھا اک طرف بشاش جپتا ہر کا نام

چرخ کی نیرنگیوں سے گفتگو کرتا ہوا — رنگِ عرفاں، روح کی تصویر میں بھرتا ہوا

جھاڑیاں تھیں سبز دریا کے کنارے جابجا — پھول کملائے ہوئے تھے سست تھی موجِ ہوا

راہ میں جالے لگے تھے، پتیوں پر گرد تھی — لانبی لانبی گھاس ہلتی تھی، تپا اور زرد تھی

جمع تھے اس طرح پتے جابجا سوکھے ہوئے — جس طرح شادی کے خیمے صبح کو الٹے ہوئے

جھاڑیوں سے یوں دبے پاؤں گذرتی تھی ہوا — بانسری کی دور سے جس طرح آتی ہے صدا

یوں پڑے تھے زیرِ شاخِ گل شگوفے چاک چاک — جیسے گردِ شمع وقتِ صبح پروانوں کی خاک

طائرِ درماندہ کوئی بول اٹھتا تھا اگر — ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا کوہ و دشت پر

اور سناٹا سا وہ جس میں ہو گم آوازِ رعد — دل پہ ہوتا ہے جو طاری نالۂ پیہم کے بعد

اُس طرف رنگِ شفق تھا چرخ پر چھایا ہوا — اس طرف دل کوہ و صحرا کا تھا مرجھایا ہوا

خار و خس پر تیلیاں ہر سو پڑی تھیں بے خبر ابر کے دو ایک ٹکڑے تھے پریشاں چرخ پر
شام کا چہرہ غمِ پنہاں سے کچھ اُترا سا تھا پانی تھم تھم کر جو بہتا تھا تو سنّاٹا سا تھا
خود بخود تاریک ساحل پر بھر آتا تھا دل بڑھ رہی تھی تیرگی رہ رہ کے گھبراتا تھا دل

کہہ رہا تھا رنگ، غم کا ابر چھا جانے کو ہے
سانحہ کوئی قیامت خیز پیش آنے کو ہے

جاتے جاتے ایک گوشہ کی طرف پہنچی نظر فرطِ غم سے رہ گیا شاعر کلیجہ تھام کر
دیکھتا کیا ہے کہ دریا کی روانی ہے اُداس جل رہا ہے اِک جنازہ، روشنی ہے آس پاس
کانپ کانپ اُٹھتی ہے جنگل کی سیاہی بار بار اُٹھ رہے ہیں لاش سے شعلے، فضا ہے بیقرار
روشنی شعلوں کی اِک پیشانیِ زرّیں پہ ہے ظلمتِ اندوہ بیوہ کے رُخِ غمگیں پہ ہے
ہے رنڈاپا سر پہ شمشیرِ جفا تولے ہوئے سرنگوں بیٹھی ہے رُخ پر کاکلیں کھولے ہوئے
کُندنی شعلے ہیں غلطاں چمپئی رخسار میں دل دھڑکنے سے ہے جنبش سی گلے کے ہار میں
اہتمامِ مرگ میں یہ شاعری لبریزِ یاس ہاتھ میں مہندی رچی ہے بر میں جوڑی کا لباس
آہ یہ عالم، کہ اب تک مست ہے، موجِ نسیم آ رہی ہے جسم سے شادی کے پھولوں کی شمیم
کہہ رہی ہے کیا بتاؤں کیا تمنّا دل میں ہے شمع یہ کس کے جنازہ کی مری محفل میں ہے

خاک سے اُٹھتی ہے پھر کرتی ہے شعلوں کا طواف
کہتی ہے اے شرم کی دیوی! مجھے کرنا معاف

مُڑ کے پھر میّت سے کہتی ہے "اجازت دیجیے"
اب تو اس ایندھن کو بھی جلنے کی رُخصت دیجیے

آپ کو موت آ گئی، عالم پریشاں ہو گیا
گھر ابھی بسنے نہ پایا تھا، کہ ویراں ہو گیا

یاد ہے، ہاں، مجھ کو شادی کا ترنّم یاد ہے
ہاں انہیں ہونٹوں پہ آیا تھا تبسّم یاد ہے

آپ کے سینے سے شعلے اُٹھ رہے ہیں بار بار
جل رہی ہے یہ مری اُجڑی جوانی کی بہار

پُوچھیے اُس سے کہ دُنیا کیا تھی اور کیا ہو گئی
جس نے گھونگٹ بھی نہ اُلٹا تھا کہ بیوہ ہو گئی

پھُنک گئیں میری بہاریں جل گیا میرا سنگار
تیری بند آنکھیں ہیں میری زیب و زینت کا مزار

گھر سے ہمجولیاں، مل جل کے گانے آئی تھیں
مالنیں، پھُولوں کا گہنا کل پہنانے آئی تھیں!

آج قرباں گاہِ عبرت پر چڑھانے کے لیے
موت آئی ہے مرا زیور بڑھانے کے لیے

زندگی جا دُور ہو دُنیا ہے آنکھوں میں اُجاڑ
موت! جلدی کر کہ ٹوٹا ہے رنڈاپے کا پہاڑ

کیوں کھڑی ہے؟ دُور یوں ڈالے ہوئے تیوری پہ بل
مجھ کو بھی کھا لے، قسم ہے تجھ کو او ڈائن اجل

دیکھتی ہے تو؟ کہ میں ہوں کس قدر جینے سے سیر
او سیہ رُو موت! خُونی موت! کیوں کرتی ہے دیر؟

دیکھ میرے رُخ پہ اشکوں کی فراوانی کا سیل
اپنے جبڑوں کو ہلا، تاریک غاروں کی چڑیل!

رینگ، ناگن رینگ! مجھ بیوا کو ڈسنے کے لئے
کیا یہاں آئی ہے منہ اپنا جھلسنے کے لئے

کیوں کھڑی ہے یوں الگ ٹھٹکی ہوئی سج سج بنا
میری باتوں نے تجھے کیا موت! برہم کر دیا
یہ اگر ہے؟ تو جھکا کر میں ترے قدموں پہ سر
مانگتی ہوں در گذر کی بھیک مجھ پر رحم کر
اے مبارک موت، اے رازِ کمالِ زندگی
اے جہانِ خوابِ نوشیں! اے مآلِ زندگی
اے پیامِ روشنی! اے سرِ بقا! تاجِ حیات
اے نظامِ دہر! اے رفتارِ نبضِ کائنات

میری ظلمت پر بھی ڈال اپنی انوکھی روشنی
آ، ادھر آ، شاہزادی عالمِ ارواح کی

کہہ کے یہ لپکی چتا کے سمت وہ نازک خرام
اور کہا، اے دکھ بھرے سنسار! اے میرا سلام
بس یہ سُنتا تھا کہ جھپٹے اسکی جانب اس بھی
دیکھتے ہی آپ کو، کم سن تو تھی، گھبرا گئی!
ہر طرف پہلے تو دیکھا دل میں کیا کیا ٹھان کے
اور پھر گردن جھکا لی، داس کو پہچان کے
ہو گئی فرطِ حیا سے رُوحِ غمگیں بیقرار
انگلیاں اپنی مروڑیں دیر تک دیوانہ وار
سر جھکا، ماتھے پہ زُلفِ ناز لہرانے لگی
حسن کو آغوشِ غم میں نیند سی آنے لگی
چپ ہوئی، تو اور دردِ ہجر دُونا ہو گیا
دی صدا دل نے، ترا پہلو تو سونا ہو گیا

یہ صدا سُنتے ہی دم اُلجھا، پھریری آ گئی
اک گھٹا دل سے اُٹھی، ارض و سما پر چھا گئی

رو کے پھر کہنے لگی، بابا دُعا دیجیے مجھے
زندگی کے پاپ سے جلدی چھُڑا دیجیے مجھے

آپ کی داسی پہ اب اس جگ میں رہنا بار ہے
آگ اس چھاتی میں روشن ہے، چِتا تیار ہے

جھونک بھی دیجیے مجھے اس آگ کے انبار میں
میں اکیلی ہُوں، کوئی میرا نہیں سنسار میں

داس نے پھر تو قریب آ کر بہ نرمی یوں کہا
اے مری نادان بچّی! سوچ تو کہتی ہے کیا

مرنا جینا ایک ہے، جن کو ذرا بھی گیان ہے
وہ اُدھر کا مرتبہ ہے، یہ اِدھر کی شان ہے

زندگی ہے نقص سے معمور، اک مہمل سی بات
موت ہے شیرازۂ قانونِ تکمیلِ حیات

موت یکسو، زندگی مجموعۂ اضداد ہے
”زندگی“ ہے وقت کی پابند، ”موت“ آزاد ہے

زندگی ہے رُوح کو محدود کر لینے کا نام
موت ہے انساں کے لامحدود ہو جانے کا نام

کہتے ہیں ”فانی“ جنہیں ہم وہ فنا ہوتے نہیں
مرنے والے اصل میں ہم سے جُدا ہوتے نہیں

قیدِ ہستی سے کوئی ذرّہ رہا ہوتا نہیں
ٹُوٹ جاتا ہے قفس، طائر فنا ہوتا نہیں

عشق کے مالے کا اِک موتی بکھر سکتا نہیں
اتحادِ باطنی مرنے سے مر سکتا نہیں

عشق کی شاخیں کسی آندھی سے جھک سکتی نہیں
رُوح کی سرگوشیاں مرنے سے رُک سکتی نہیں

زندگی بے رُوح آوازوں میں دیتی ہے پیام
موت سرِّ الفاظ کو ٹھکرا کے کرتی ہے کلام

زندگی سے تنگ سانچے میں سما جاتا ہے عشق
موت سے عالم کی پہنائی پہ چھا جاتا ہے عشق

زندگی کی موج پر گلبرگِ تر بنتا ہے عشق
موت کے گرداب میں لعل و گہر بنتا ہے عشق

بادِ طوفانی کے دیوتا پاس آ سکتے نہیں
اس دیئے کو موت کے جھونکے بجھا سکتے نہیں

موت! کیا شے ہے، کہ توڑے جبکہ خود رُوح الامیں
عاشقی کے رشتۂ محکم کو چھو سکتے نہیں

جسم پر بنیادِ عشق خود نما ہوتی نہیں
رُوح اس تبدیلِ ہیئت سے فنا ہوتی نہیں

زندگی، دھندلا سا اِک جلوا ہے اور کچھ بھی نہیں
موت، اک باریک سا پردا ہے اور کچھ بھی نہیں

غور کر دل میں کہ ہو جائے حقیقت بے نقاب
ٹوٹتے دیکھے تو ہوں گے بارہا تو نے حباب؟

مر کے بھی دریا کے سینے سے کہیں جاتے نہیں
رہتے ہیں دریا ہی میں لیکن نظر آتے نہیں

یونہی تیری شمع سوزاں بھی تری محفل میں ہے
مرنے والا آنکھ سے اوجھل ہے لیکن دل میں ہے

جو چِتا میں جل رہا ہے، وہ ترے پہلو میں ہے
کانپتے ہونٹوں میں ہے بہتے ہوئے آنسو میں ہے

یہ کہا شاعر نے، اور کچھ دیر آنکھیں بند کیں
دیکھتے ہی دیکھتے بیوہ کی آنکھیں کھل گئیں

ہنس کے پھر کہنے لگی، بابا بڑا وسواس تھا
دُور میں جس کو سمجھتی تھی، وہ میرے پاس تھا

یہ کہا اور دفعتہً دل میں چمک پیدا ہوئی
زُلف میں تابندگی، رُخ پہ دمک پیدا ہوئی

صحنِ غم میں باغِ عشرت کی ہوا آنے لگی
کان میں راحت کے نغموں کی صدا آنے لگی

زیرِ لب کہنے لگی، عالم ہے کیا تنویر کا
دل مرا شیشہ ہے ان کی چاند سی تصویر کا

ہے کوئی جلد آئے، شادی کا مری ساماں کرے
بدّھیاں آکر نہائے، مانگ صندل سے بھرے

پھول برسیں جلد انگنائی کو بھرنے کے لئے
زرفشاں طاؤس آئیں رقص کرنے کے لئے

ابر سے کہدو کہ میری زُلف پر سایہ کرے
جشن کی ڈیوی کدھر ہے، بزم میں جلوا کرے

کہدو مشّاطہ سے آئے، رُخ کھونے کے لئے
خم بہ خم زُلفوں میں پھر موتی پرونے کے لئے

عشرتِ جاوید، باندی ہے مرے احکام کی
اب سکھی انیز نگیاں عاجز ہیں صبح و شام کی

سرمدی نغموں کو ہے اب ربط میرے ساز سے
آشیاں اونچا ہے میرا وقت کی پرواز سے

حکم رقاصہ کو دو چھاگل پہنکر پاؤں میں
آئے پچھلی رات تاروں کی سہانی چھاؤں میں

خاک تلسی کی نظر سے رشکِ گلشن ہو گئی
معرفت میں ڈوب کر بیوہ سہاگن ہو گئی!

جھرّیاں

اِس ضعیفہ کی دیکھئے صورت
کس قدر جھرّیوں کی ہے کثرت

پوپلا منہ، کہ ہے بد منظر
صبح جیسے مریض کا بستر

تنگ، دھندلی، دھنسی ہوئی آنکھیں
جیسے فرمانِ قتل پہ مُہریں

حلقے گہرے سیہ بھیانک سے
جیسے اندھے کنوئیں بیاباں کے

چھاؤں پلکوں کی سرد ڈھیلوں پہ
جیسے بیمار پر سیہ چادر

دانت دو اک قریبِ گرنے کے
بھولے بھٹکے سے راہرو جیسے

کوزہ پُشتی سے چال بے تاثیر
جیسے ٹوٹی ہوئی کمان کا تیر

بال رُخ پر سفید زُلفوں کے
ملگجی دھوپ، لاش پر جیسے

مُردہ لہجے کی کپکپی، گویا ٹوٹی قبروں کے روزنوں میں ہوا
جھُرّیاں مُنہ پہ، خال و خد سنسان جیسے دلدل میں گاڑیوں کے نشان
جھُرّیوں میں نہاں ہے اِک دُنیا یہ نشاں ہیں ریکارڈ[1] کے گویا
جن میں سوئے ہُوئے ہیں مُدّت سے کروٹیں لے رہے ہیں حسرت سے
زمزمے عہدِ کامرانی کے
گیت گزُری ہُوئی جوانی کے

---

[1] گراموفون کے ریکارڈ

کِسان

جھٹپٹے کا نرم رَو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

دشت کے کام و دہن کو، دن کی تلخی سے فراغ
دُور، دریا کے کنارے، دُھندلے دُھندلے سے چراغ

زیرِ لب ارض و سما ہیں، باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردُوں کے بُجھ جانے سے اِک ہلکا سا دُود

وُسعتیں میدان کی، سُورج کے چُھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر، خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامُشی اور خامُشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خُنکی سے گویا دن کی گرمی کا گِلا!

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں، کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا

خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان
بامِ گردوں پر کسی کے رُوٹھ کر جانے کی شان

دُوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سُرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور

پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں   بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتّیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی

نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں، اور اک قوی انسان، یعنی کاشتکار   ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں   ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں

ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ   ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امّید و بیم   محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم

صبح کا فرزند، خورشیدِ زرافشاں کا علم   محنتِ پیہم کا پیماں، سخت کوشی کی قسم

جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ   ماہ کا دل، مہرِ عالمتاب کا نورِ نگاہ

قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام   منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام

خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار   جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسّم کا مدار

جس کی محنت کا عرق طیّار کرتا ہے شراب   اُڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جانِ وردو گلاب

قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق   شعلہ خو جھونکوں کا ہمدم، تیز کرنوں کا رفیق

خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب   جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب

لہرکھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو | جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو
دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر | دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے اِمرت نبضِ تاک | جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک
سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ | مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خُون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں | لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عزّ و وقار | کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی | جس کے بُوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ | جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدّن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پہ اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پر مشقّت کے نشاں | کھیت سے پھیرے ہوئے مُنہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل!
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل!

کون ہل؟ ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل | قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل

خوشنما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سُراغ
خاندانِ تیغِ جوہردار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شامِ زیرِ ارض کو صُبحِ درخشاں کا پیام

ڈُوبتا ہے خاک میں جو رُوح دَوڑاتا ہُوا
مضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چونکاتا ہُوا

جس کے چھُو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مُسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک

جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن اُمّید کی

جس کا مَس خاشاک میں بُنتا ہے اِک چادر مہین
جس کا لوہا مان کر، سونا اُگلتی ہے زمین

ہَل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سُرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رَواں

اُس سیاسی رتھ کے پہیّوں پر جمائے ہے نظر
جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو رَوند کر

اپنی دَولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہُوئے
دیکھتا ہے مُلکِ دُشمن کی طرف جاتے ہُوئے

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچّوں کے دُھندلے آنسوؤں پہ ہے نگاہ

پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا اُمید بیوی کا شبابِ سوگوار

سوچتا جاتا ہے کِن آنکھوں سے دیکھا جائیگا
بے رِدا بیوی کا سر بچّوں کا مُنہ اُترا ہُوا

سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں!
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں!

ایک دل، اور یہ ہجومِ سوگواری! ہائے ہائے
یہ ستم، اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار

بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت! ساری کائنات؟

ظلم، اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

دیکھ کر تیرے ستم، اے حامیِ امن و اماں!
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں

ادّعائے پیرویِ دین و ایمان، اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں، جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہلِ دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بے تاب ہیں

مہاجن اور مُفلِس

مہاجن

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی!
سر پہ چٹیا، مُردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
دانت میلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغدار
ناک میں مونچھوں کے گونجے، پیٹ میں توندی کا غار
سامنے غلّے کے بورے، پُشت پر الماریاں
بغبغوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں
کہنیاں، تکیے کے اندر، وزن سے دھنستی ہوئی
چُست صدری، دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی

خُوب لے لے کر ڈکاریں، دِل کو بہلاتا ہُوا
دونوں نتھنوں کو پھُلائے، توند سہلاتا ہُوا
ہنس کے غوطے، آب سرد و گرم میں دیتا ہُوا
قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہُوا
عُذر کرتا پے بہ پے، تیوری چڑھاتا بار بار
شدّتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار!
کِشتیٔ ہستی کو جُوئے سیم میں کھیتا ہُوا
اُلٹی سانسیں، فربہی کے بار سے لیتا ہُوا
رُخ کی تاریکی پہ زر کی سُرخیاں چھائی ہوئی
بے حقیقت خاک۔ سونا بن کے اِترائی ہُوئی
کان کے بالے، نمودِ زر کا دَم بھرتے ہُوئے
سُود کے بارے میں کچُھ سرگوشیاں کرتے ہُوئے
عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہُوا!
بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہُوا

مُفلِس

ضُعف سے آنکھوں کے نیچے تتلیاں پھرتی ہُوئی
اَوجِ خود داری سے دِل پر بجلیاں گرتی ہُوئی
لاش کاندھے پر خُود اپنے جذبۂ تکریم کی
مُلتجی چہرے پہ لہریں سی اُمید و بیم کی
عِزّتِ اَجداد کے سَر پر دمادم ٹھوکریں
رشتۂ آواز پر لفظوں کی پیہم ٹھوکریں
چہرۂ افسردہ پر ٹھنڈا پسِینہ شرم کا
سُست نبضیں، بھیک کا، لہجے کے اندر ٹھیکرا
قرض کی درخواست کی اُلجھی ہوئی تقریر میں
کپکپی اَعصاب کی، بے چین دل کی لرزشیں!
اِک طرف حاجت کی شِدّت، اک طرف غیرت کا جوش
نُطق پر حرفِ تمنّا، دِل میں غُصّے کا خروش

جُنبشِ مژگاں کے زیرِ سایہ، ناداری کی رات
جوہرِ انسانیت، جوڑے ہُوئے آنکھوں میں، ہات
سانس، دہشت سے زمیں کی، آسماں روکے ہُوئے
مفلسی، مردانہ لہجے کی عناں روکے ہُوئے
لب پہ خُشکی، رُخ پہ زردی، آنکھ شرمائی ہُوئی
چشم و ابرُو میں خُودی کی آگ کجلائی ہُوئی
لفس میں شیرانہ تیور، آرزُو، رُو بہ مزاج
احتیاج و احتیاج و احتیاج و احتیاج

محسوسات

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح
کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہ گزار
حافظے پر یونہیں ایک بیدار کن گہری خراش
ڈال دیتی ہے شبِ غم میں پپیہے کی پکار

رکھے ہوئے سونے کا طبق، ناز سے سر پر
کہرے میں نظر آتی ہے، یوں صبحِ درخشاں
ہو جاتی ہے جس طور سے انساں کی شرافت
ہنگامۂ افلاس میں کچھ اور نمایاں

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث
تری "نگاہ" ہے یا وہ "خیالِ" دل افروز
بدل رہا ہے جو پہلو، ضمیرِ شاعر میں
اور آب و تاب سے موزوں نہیں ہوا ہے ہنوز

رہروؤں کو دُور سے پہچاننے کے واسطے
جس طرح انسان کی سیرت پرکھنے کیلئے
سعی کی جاتی ہے یوں دھندلی شبِ مہتاب میں
ٹھوکریں کھاتی ہیں نظریں ظاہری آداب میں

وصل کی راتوں میں اب اس طور سے آتا ہے یاد
جیسے اکثر نیند میں کروٹ بدلتے وقت جوش
ہجر کے عہدِ زبوں کا گریۂ صبح و مسا
کان میں آتی ہے ہلکی موجِ باراں کی صدا

بوندیوں کا سلسلہ ہے اور ہلکے ابر سے
وقتِ گریہ جس طرح مکتوبِ غم لکھتے ہوئے
پڑ رہی ہیں اس طرح سبزے پہ کرنیں گاہ گاہ
آنسوؤں سے چھن کے آتی ہے سرِ کاغذ نگاہ

کیا بتاؤں کہ وہ دمِ گلگشت
جیسے کلیوں پہ رشحۂ شبنم
کس مزے سے قدم اُٹھاتی ہے
جیسے آنکھوں میں نیند آتی ہے

پھاڑتے ہی جیسے میلا چیتھڑا اُڑتی ہے گرد
گفتگو کرتے ہیں جب آپس میں از رہِ نفاق
یونہیں وہ دو شخص جو اک دوسرے سے ہیں خفا
دیکھتا ہوں اُنکے ہونٹوں سے غبار اُڑتا ہوا

خشک ہو کے سایہ بخشی کی نہیں رہتی جب آس
حالتِ اشجار یوں اُس وقت ہوتی ہے سقیم
جیسے آنکھوں میں گدا کی دیکھ کر عزمِ سوال
سر جُھکا لیتا ہے فرطِ شرم سے مفلسِ کریم

وقتِ شب کچھ اور بھی تاریک کر جاتا ہے یوں
اپنی چمکائی ہوئی ظلمت کو موٹر کا غبار
جس طرح کاندھے پہ رکھ کر ہات دم بھر کو خوشی
دوش پر غم کا نیا اک اور رکھ جاتی ہے بار

ہوا پُر شور ہے اور ابر ہے موسم کی یورش سے
لبِ ساحل، شگفتہ چاندنی مرجھائی جاتی ہے
یونہیں آزردۂ انفاس آئینے کی سی حالت
عزیزوں کی شکر رنجی کی تہ میں پائی جاتی ہے

صبح طالع ہو رہی ہے اور فضائے سرد میں
کھا رہا ہے پیچ و خم، تاریک کُہرے کا دھواں
شہر کی مخلوق، یوں گلیوں میں آتی ہے نظر
خواب میں جس طور سے دیکھے کوئی پرچھائیاں

ایک دلکش ملیح چہرے پر
صُبح کی ہیں صباحتیں طاری
جیسے نمکین چیز میں اے جوشؔ
ایک ہلکی، مٹھاس کی دھاری

تلملاتی مچھلیوں کی شوخیوں سے جس طرح
سطح پر تالاب کی پڑتے ہیں حلقے بار بار
یونہیں دل کی لغزشِ پیہم کے ہاتوں ہر نفس
میری چشمِ تر میں رہتی ہے تمنّا بے قرار

پھول مٹھی میں اگر کچھ دیر تک رہتے ہیں بند
ہات میں ہوتی ہے پیدا، اک معطّر سی نمی!
یونہیں جب کچھ دیر کرتا ہوں تصورِ حسن کا
سانس میں ہوتی ہے خوشبو اور آنکھوں میں تری
اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جاناں نے مجھے
بھینچ کر آغوش میں تا دیر چھوڑا ہے ابھی

سنایا مجھے ایک مطرب نے آج
وہ نغمہ، کہ تھا دل میں سویا ہوا
جوانی کی راتوں میں یادش بخیر
جسے چھیڑتا تھا کوئی مہ لقا
کچھ اس طرح نغمے کا ہر زیر و بم
مری سمت آنکھیں اٹھانے لگا
کسی اجنبی شہر میں جس طرح
کوئی بھولا بچھڑا ہوا آشنا
سرِ راہ لوگوں کے انبوہ سے
بڑھے یک بیک مسکراتا ہوا

سر سے نزدیک ہو کے اِک طائر   یُوں اُڑا صُبح، نیند جیسے آئے
نصف لمحے کے واسطے، مجھ کو   گیت اِس طرح شہپروں کے سُنائے
ذہن سے جس طرح کہ بات کوئی
یاد آتے ہی محو ہو جائے

جس طرح اے حُسنِ خود بیں! انبغِ کاہ و رُوحِ کوہ   روز و شب اک لرزشِ پیہم سے سہتے ہیں دو چار
کاہ کے دل میں مچلتا ہے بفکرِ رنگ و بُو   تابشِ خورشید و موجِ باد و باراں کا شرار
کوہ میں فرطِ خوشی سے ناتراشیدہ صنم   ڈھونڈتے ہیں بُت تراشوں کی نظر دیوانہ وار
یونہیں میرے مضمحل جوہر، مرے افسردہ عزم
تیرے ہلکے سے تبسُّم کے لئے ہیں بیقرار

باغ پر ہیں جھکے ہُوئے بادل   بُو ہے جھونکوں میں سرد پانی کی
کُنج پر چھائی ہے وہ کیفیت   نیند جس طرح نوجوانی کی

تأثرات

پروگرام

سرشکِ تبسم

بحضرۂ ساقی

صحنِ چمن

گلبانگِ نوشانوش

خالی بوتل

کل رات کو

جوانی کی رات

در حدیثِ دیگراں

گمنام ولولے

موسیقی کا جزیرہ

جادو کی سرزمین

پروگرام

(سنہ ۱۹۳۳ء)

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملیگا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظّارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملیگا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملیگا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملیگا

اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملیگا

اور ہوگا کوئی جبر، تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح خانۂ ویراں میں ملیگا

سرِشکِ تبسّم

اُٹھا ساغر، کہ انساں کُشتۂ آلام ہے ساقی
یہ بربط ہے، یہ مے، آگے خُدا کا نام ہے ساقی

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو رحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آ سکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی، فقط اک نام ہے ساقی

سُناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقّع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی

اُدھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
اِدھر اب تک وُہی ابہام کا اِبہام ہے ساقی

اُدھر "تکمیلِ دیں" کا ہو چکا ہے دعوئ محکم
اِدھر ایماں تھا جیسا خام اب تک خام ہے ساقی

اُدھر شدّت کیساتھ اعلان ہے "اتمامِ نعمت" کا
اِدھر ہر سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قُدرت ہے
سزا کیا ہو گی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی
خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رشتہ ہے جب دستِ ماحول و وراثت میں
تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی
یہ کس آغاز کی سعیِ زبوں انجام ہے ساقی!

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی
جہاں موجِ ہوا تک مرغِ زیرِ دام ہے ساقی

تبسم اک بڑی دولت ہے، میں بھی اس کا قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں
وہ آبِ صاف بھی افشردۂ اصنام ہے ساقی

خروشِ گریہ ہی حامل نہیں غمہائے پنہاں کا
یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کہرام ہے ساقی

لڑکپن ضد میں روتا تھا، جوانی دل کو روتی ہے
نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی

تمنائیں جگاتی ہیں، تو ناکامی سلاتی ہے
نہ اپنی صبح ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی

بڑی دریا دلی کیساتھ ہر خوں ریز طاقت کو
مشیت کی طرف سے اذنِ قتلِ عام ہے ساقی

یہ کس کی مُہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر
کہ ہر ذرہ ازل سے لرزہ براندام ہے ساقی

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظؔ و خیامؔ ہے ساقی

بحضرِ ساقی

تجھے کیا دورِ گُل ہے، یا زمانِ خار ہے ساقی!
تو خُود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی!

حقیقت کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی دو عالم کی
جو کچھ آتی بھی ہے ناقابلِ اظہار ہے ساقی

ترے مستوں کو روز و شب کی آویزش سے کیا مطلب
یہاں تو تیرگی بھی مطلعِ انوار ہے ساقی

ترے خدمت گذاروں کو حق و باطل سے کیا مطلب
یہاں تو "خیر" بھی "شر" کی رفیقِ کار ہے ساقی

یہاں ہر عقدہ، اِک کھلتا ہُوا در ہے فراغت کا
یہاں ہر قید اک گرتی ہُوئی دیوار ہے ساقی

قسم اِس جام کی رقصاں ہے جسمیں کیف و سرمستی
کہ اِس مُٹھّی میں روحِ ثابت و سیّار ہے ساقی

عقائد کے ہزاروں عقل فرسا کارواں کا
فقط اک واہمہ ہی قافلہ سالار ہے ساقی

نہ گھبرا، انتہائی صبر و نرمی سے مداوا کر
کہ عقل انساں کی اک عمر سے بیمار ہے ساقی

بہت عجلت نہ فرما کار و بارِ دل کے اجرا میں
کہ یہ دُنیا اسیرِ اندک و بسیار ہے ساقی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

مرا ایمان ہے اک لرزہ براندام بے دینی
مرا اقرار اک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوش پر اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لا اُبالی کس قدر ہُشیار ہے ساقی

صحنِ چمن

آکہ پھر صحنِ چمن باغِ جناں ہے ساقی
دُور تک سلسلۂ ابرِ رواں ہے ساقی

کُنج میں مُرغِ چمن زاد ہے سرگرمِ خروش
باغ میں بادِ صبا عطر فشاں ہے ساقی

آج خاشاک کے لب پہ بھی ہیں شیریں نغمے
آج ذرّات کے مُنہ میں بھی زباں ہے ساقی

شاخساروں پہ ہیں مُرغانِ چمن گرمِ خروش
آسمانوں پہ گھٹا نعرہ زناں ہے ساقی

اس ترنّم میں ازل ہے نہ ابد اے ہمراز
اس تلاطم میں زماں ہے نہ مکاں ہے ساقی

اس برستے ہوئے موسم کی ہر اک ساعتِ کیف
شبِ آدینہ ماہِ رمضاں ہے ساقی

بزم پر وادیٔ ایمن کا گماں ہوتا ہے
آج وہ نورِ سرِ رطلِ گراں ہے ساقی

خار بدمست ہیں گُل وجد میں کلیاں سرشار
آج گلشن میں قیامت کا سماں ہے ساقی

پائے جاناں پہ کروں کیوں نہ پیاپے سجدے
شورِ قلقل مجھے گلبانگِ اذاں ہے ساقی

غمِ ایّام پہ دم بھر کے لئے غور کریں!
اتنی فرصت ترے مستوں کو کہاں ہے ساقی

بے خطر ہو کے پلا مے کہ حقیقت میں قضا
بزدلوں کا فقط اک وہم و گماں ہے ساقی

کھول نغموں سے درِ رمز و اشارات کہ آج
سترِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے ساقی

روک رندوں کو نہ تا دیر کہ یہ دورِ بہار
موسمِ بندگیٔ لالہ رخاں ہے ساقی

نرمی و لُطف سے لے کام کہ دل کے ہاتوں
زندگی کا رگِ شیشہ گراں ہے ساقی

کیوں سُنوں زمزمۂ مدّعیانِ عرفاں
بادہ خود کاشفِ اسرارِ نہاں ہے ساقی

جام دے جام کہ ہر قطرۂ صہبائے کہُن
مُصلحِ نُسخۂ اجزائے جہاں ہے ساقی

کیفِ صہبا سے اُمنگوں کو جگا دے تو بھی
فیضِ باراں سے ہر اک ذرّہ جواں ہے ساقی

آج جی بھر کے پلا باغ میں پگھلی ہوئی آگ
کوہساروں پہ گھٹاؤں کا دھُواں ہے ساقی

چہرۂ خاک کی رنگینی و شوخی کی طرف
عالمِ پاک بحسرت نگراں ہے ساقی!

نشہ جس طرح مچلتا ہے رگِ صہبا میں
سینۂ ابر میں یُوں برق تپاں ہے ساقی

ان کی خلقت نہیں حورانِ بہشتی کیلئے
یہ تو زہّاد کی شکلوں سے عیاں ہے ساقی

ہاں پلا آتشِ سیّال کہ جس کی ہر بُوند
شمعِ محرابِ جہانِ گزُراں ہے ساقی

اِن لچکتی ہوئی شاخوں کے خُنک سائے میں — مے کی اک بُوند متاعِ دو جہاں ہے ساقی
آ! کہ یہ وقت ہے اِک شمع سرِ جادۂ باد — اُٹھ! کہ یہ عُمرِ رواں آبِ رواں ہے ساقی
شیخ کو کون یہ سمجھائے کہ گُل رنگ شراب — مایۂ تربیتِ رُوحِ رواں ہے ساقی
تجھ سے ممکن ہو تو اس درد کا درماں کر دے — زندگی کو مرضِ سود و زیاں ہے ساقی

جوؔش اعظم کی صدارت میں پس و پیش نہ کر
جوؔش تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

گلبانگِ نوشانوش[1]

اُٹھا ساغر کہ بیداریٔ وبالِ ہوش ہے ساقی
زمانہ تیغ در دست و کفن بر دوش ہے ساقی

ترے آزادہ مشرب دُردہ خواروں کی تمنا میں
ہلالِ عید اِک کھلتا ہُوا آغوش ہے ساقی

زمانہ رقص میں ہے بج رہی ہے وقت کی چھاگل
چمن میں آج وہ گلبانگِ نوشانوش ہے ساقی

پسینہ آگیا ہے خلد میں حُوروں کے ماتھے پر
حسینوں کی جوانی آج یُوں گُل پوش ہے ساقی

اگر اک بُوند ٹپکا دُوں تو لَو دینے لگے دُنیا
مرے ساغر میں ایسا بادۂ سرجوش ہے ساقی

زمیں کے آبگینے کو کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے
ترے رندوں کو مستی میں بھی اتنا ہوش ہے ساقی

اُٹھا لے جامِ زر اس کو پلا جامِ سفالیں میں
کہ یہ کونین کا ٹھکرانے والا جوش ہے ساقی

[1] عید کا چاند دیکھ کر یہ نظم کہی گئی تھی۔

خالی بوتل

ٹیس سی اک ہو رہی ہے قلبِ حق آگاہ میں
کیا بتاؤں ہمنشیں کیا شے پڑی ہے راہ میں
کیوں نہ چھا جائے دُھواں سا مطلعِ اِدراک پر
بادۂ رنگیں کی بوتل، اور ٹھنڈی خاک پر
آہ اے خاموش دیوی، شب کو تیرے سامنے
کتنے رنگیں راگ ہوں گے، کتنے شیریں قہقہے
جلوہ گر ہو گی نہ جانے کس بہشتِ اَوج میں
بہ رہی ہو گی ہزاروں زمزموں کی موج میں

اے طلسمِ نغمہ و افسونِ کیف زندگی
اے حبابِ آبگینہ، اے سحابِ سرخوشی
اے حصارِ عافیت، اے گنبدِ رقص و غنا
اے حریمِ سربہ مُہر، اے معبدِ صدق و صفا
مجھ سے بڑھ کر کون کرسکتا ہے تیرا احترام
مَیں کہ ہوں اس وقت مینائی شریعت کا امام
تجھ میں شب کو، جب کہ حسنِ بوستاں دہ چند تھا
دُخترِ رز کی نوجوانی کا تموّج بند تھا
حیف اے قصرِ بلوریں، تجھ پہ، اور گرد و غبار
جس میں کل تک معتکف تھی دُخترِ ابرِ بہار
شب کہ محفل میں تری شورِ رباب و چنگ تھا
راستی تھی، راگنی تھی، روشنی تھی، رنگ تھا
جذب ہیں سینے میں تیرے گرمیاں نغمات کی
دل میں تیرے سو رہی ہیں کتنی دھومیں رات کی

کل تری ہر بُوند تھی، اے خالقِ شعر و شباب
ماہتاب، اندر عنان و آفتاب، اندر رکاب
گُم ہے تیرے جوہروں میں کتنے سینوں کی اُمنگ
تُجھ میں غلطیدہ ہے کتنی نرگسی آنکھوں کا رنگ
تُجھ میں محوِ خواب ہے، اے چشمۂ باغِ ارم
کتنے برگِ لالہ سے ترشے ہوئے ہونٹوں کا خم
تجھ پہ ہوگی رات کو کِس ناز سے چھٹکی ہوئی
کِتنے افسوں خیز مُکھڑوں کی گلابی چاندنی
اور آج انداز و افسُون و ادا کچھ بھی نہیں
ایک عبرتناک شِیشے کے سوا کچھُ بھی نہیں

اے سپہرِ تاک کے ٹوٹے ستارے، السّلام
اے حریمِ کیف و مستی کے منارے السّلام
السّلام، اے رشتۂ بشکستہ گوہر السّلام
السّلام اے جنتِ بے موجِ کوثر، السّلام
السّلام، اے شیشۂ محرومِ صہبا، السّلام
السّلام، اے محملِ گُم کردہ لیلیٰ، السّلام

کل رات کو

۱۹۳۴ء

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہربان تھا وہ بُتِ نا مہرباں کل رات کو
"ناز" تھا طغرا کشِ دیوانِ آدابِ نیاز
"تیغ" تھی پیغمبرِ امن و اماں کل رات کو
چھو رہی تھی دِل کو موجِ رنگ تیروں کے عوض
کھنچ رہی تھی ابروؤں کی یوں کماں کل رات کو
لوٹتی تھی کِس تکلّف سے ہَوا کے دوش پر
چاندنی میں کاکُلِ عنبر فشاں کل رات کو
اللہ اللہ فرشِ مے نوشی کی اوج اندیشیاں
فرشِ پا انداز تھا کون و مکاں کل رات کو

الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
ہر کلی کو آرہی تھیں ہچکیاں کل رات کو

مسندِ زرّیں پہ "سرِّ دلبراں" کے زمزمے
تھے بہ اندازِ "حدیثِ دیگراں" کل رات کو

کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالم تاب پر
سُنبلستان کا تھا گُل پر سائباں کل رات کو

پھُول تھے غرقِ عرق، پانی ہوئے جاتے تھے جام
سُرخ تھیں اُس شوخ کی یوں انکھڑیاں کل رات کو

آرہی تھی جُنبشِ مژگانِ عالم کی صدا
یوں لبِ گل رنگ تھا افسانہ خواں کل رات کو

کیا تلاطم تھا کہ میری کشتیٔ اُمید میں
کاکلِ شبرنگ کا تھا بادباں کل رات کو

غیب کے پردے سے آوازیں مُبارکباد کی
آرہی تھیں کارواں در کارواں کل رات کو

سامنے تھی جلوہ گاہِ کُرسی و لوح و قلم
اک دریچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو

ہر سخن میں گونجتی تھی اسمِ اعظم کی صدا
ہر نفس تھا اک حیاتِ جاوداں کل رات کو

وقت کے ہاتوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں
ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو

وہ ترنّم تھا کہ علم و عقل کے ہوتے ہوئے
زلیت کی سی شے تھی اک جنسِ گراں کل رات کو

چاندنی، دریا، شگوفے، راگنی، بربط، شراب
پھوٹ پڑی تھیں بزم پر رنگینیاں کل رات کو

نرگسِ مخمور و آبِ آتشیں و موجِ گل!
ہر طرف تھیں سرخیاں ہی سرخیاں کل رات کو

گردنِ مینا جھکاتے ہی اُبل پڑتے تھے جام
گنگناتا اُٹھتا تھا یوں پیرِ مغاں کل رات کو

وجد میں تھی جھلملاتی مشعلوں کی روشنی
رقص میں تھا پرتوِ رطلِ گراں کل رات کو
ناز کرتی جس طرح گردوں پہ جاتی ہے دُعا
اُٹھ رہا تھا مشعلوں سے یُوں دُھواں کل رات کو
محفلِ زُہرا میں تھا ہنگامۂ رقص و سرود
آسماں پر بج رہی تھیں چُوڑیاں کل رات کو
مَیں بھی لافانی ہوں مثلِ وجہِ ربِّ ذوالجلال
دِل کو ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو
جوؔش کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی نعمتیں!
حیف! اک تو ہی نہ تھا اے رازداں کل رات کو

جوانی کی رات

۱۹۲۳ء

شب کہ حریمِ ناز میں شورِ صد اضطراب تھا
عشق بھی تھا برہنہ سر، حسن بھی بے نقاب تھا

آنکھوں میں روئے یار تھا، آنکھیں تھیں روئے یار پر
ذرّہ تھا آفتاب میں، ذرّے میں آفتاب تھا

خشک تکلّفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب حدیں
چشمکِ بے دریغ تھی، خندۂ بے حجاب تھا

حسن کی بزمِ عشوہ میں شمعِ وفا تھی ضَوفگن
عشق کی بارگاہ میں، زمزمہ باریاب تھا

سر پہ صراحیاں لئے، رقص کناں تھے مُغبچے
نرگسِ نیم باز میں، رنگِ شرابِ ناب تھا

معرکہ عظیم تھا ناز میں اور نیاز میں
زلف میں تھی برہمی، دل کو بھی پیچ و تاب تھا

موجِ ہوا میں عطر تھا، چھٹکی ہوئی تھی چاندنی
پھول تھے صحنِ باغ میں، چرخ پہ ماہتاب تھا

عشق کی نبضِ تیز میں دوڑ رہی تھیں بجلیاں
حسن کے دستِ ناز میں شعلہ فشاں رباب تھا

پرتوِ یار اِس طرف، رامش و رنگ اُس طرف — چشم بھی فتح مند تھی گوش بھی کامیاب تھا
درد سے قلب چُور تھے کیف سے رُوح مست تھی — سوز بھی بے نظیر تھا، ساز بھی لاجواب تھا

ہونٹوں کو وقتِ گفتگو جو مِلتی تھی شگفتگی
بات جو تھی، سو پھُول تھی، پھُول جو تھا گُلاب تھا

اور سحر کو، ہمنشیں! آنکھ کھلی تو کیا کہوں — طاق میں شمع کشتہ تھی چرخ پر آفتاب تھا
توبہ شکن گلابیاں، فرش پہ چُور چُور تھیں — خُلد فردش جامِ زر، شرم سے آب آب تھا
نغمہ رقص و بے خودی، جلوۂ حُسن و شاعری — شب کو تھا بحرِ بے کراں، وقتِ سحر سراب تھا
بربط و چنگ کی صدا، ایک فسُردہ گُونج تھی — شمع و شراب کا سماں، ایک پریدہ خواب تھا
لرزشِ بادہ و خمِ زلفِ سیاہ کے عوض — تھا تو چراغ کشتہ کے دود کا پیچ و تاب تھا

گنبدِ قصرِ عیش میں گُونج رہی تھی یہ صدا
رات نہ تھی وہ کیف کی، جوشِ نزاشباب تھا

درحدیثِ دیگراں

کل بارگہ ناز میں میں نے یہ کیا عرض،
بُلبُل طلبِ گُل میں ہے اِک عُمر سے مُضطر

کیسا یہ ستم ہے کہ کسی عہد میں اب تک
بُلبُل کی صداؤں سے پسیجا نہ گُلِ تر

یہ سُنتے ہی پیدا ہوئی رُخسار پہ سُرخی
کچھ شرم کے آثار، تو کچھ غیظ کے تیور

سُرخی سی جھلکنے لگی اِک دُھوپ سی ناگاہ
وہ دُھوپ چمکتی ہے جو تتلی کے پَروں پر

گمنام ولولے

گاؤں کی اک نگارِ ہوش رُبا
سر پہ ٹیکا، نہ ہات میں چھلا

اُفقِ حُسن پر بصد تب و تاب
ہو رہی ہے طلوع، صبحِ شباب

آ رہی ہے قدم بڑھائے ہوئے
بَن کی جانب نظر اُٹھائے ہوئے

گِرتے گِرتے سنبھل رہا ہے کوئی
خواب میں جیسے چل رہا ہے کوئی

انکھڑیوں میں خفیف طرّاری
خواب کا ہے سماں نہ بیداری

رُوح، بے داغ، چہرہ نُورانی
رُخ پر اک ناتمام حیرانی

ایک اِطلاق سا، نہ کیف، نہ کم
نہ تغافل کی خُو نہ ذوقِ کرم

ایک بھٹکی ہوئی سی شانِ حجاب
ایک کھویا ہوا سا استعجاب

ناشنیدہ فسانہ آنکھوں میں
وحشتِ آہُوانہ آنکھوں میں

لب پہ اِک نیم رس تبسّم سا
رات کا جیسے آخری لمحہ

رُوح میں ایک کشمکش کا ظہُور
جیسے ہلچل ہو کوئی تحتِ شعُور

دل میں رقصاں ہے رُوحِ بادِ شمال
اپنے نافے سے مُضطرب ہے غزال

دل میں ہے اک تلاش سی مَوہُوم
یہ بھی لیکن اُسے نہیں معلوم

کہ مرے دل کا مُدّعا کیا ہے
یہ رگ و پَے میں درد سا کیا ہے

مُضطرب ہے کہ یہ مقام ہے کیا
آخر اِن وَلولوں کا نام ہے کیا!

موسیقی کا جزیرہ

کانپتی ہیں اُنگلیاں مُطرب کی جب مستانہ وار
عشق کا جب نبضِ آہن میں مچلتا ہے لہو
نغمۂ شیریں کا جب گرتا ہے رنگیں آبشار
درد سے کھاتی ہیں جب موجیں ہوا کی پیچ و تاب
دن ہی رہتا ہے نظر کے سامنے باقی نہ رات
لَے میں زلفوں کی طرح جس وقت لہراتا ہے دل
رُوح ہوتی ہے جہاں اس گمشدہ شے سے دوچار

راگنی کی آنچ سے جب نرم ہو جاتے ہیں تار
لحن کے سانچے میں جب ڈھلتی ہے دل کی آرزو
دل کو چھُو لیتی ہے اک موہوم سی باریک دھار
خود سے اُٹھ جاتی ہے جب سلجھائے ماضی کی نقاب
ساز کے پردوں میں چھُپ جاتی ہے ساری کائنات
اک جنوں پرور جزیرہ میں پہنچ جاتا ہے دل
جس کے کھو جانے سے میری زندگی تھی سوگوار

پھر بھی پانے کی طرح اس چیز کو پاتا نہیں
شکل سے پہچانتا ہوں، نام یاد آتا نہیں

جادُو کی سرزمین

غرُوب، سلسلۂ کوہسار، ویرانہ
سُنا رہی ہے خموشی کو ریل افسانہ
اِدھر پہاڑ، اُدھر کھیتیوں کی پگڈنڈی
ہوائے شام کہیں گرم اور کہیں ٹھنڈی
اِدھر اُدھر کچھ اندھیرے میں مرد و زن ہیں رواں
کہانیوں کے وہ جِنّ ہیں یہ خواب کی پریاں
سیاہیوں میں چمکتی ہوئی جبینیں سی
نظر کے سامنے، جادُو کی سرزمینیں سی
رُخِ اُفق پہ سیہ دھاریوں کی باریکی
پہاڑیوں پہ گھٹا، جھاڑیوں میں تاریکی

شکستہ حال گدوں کا ہجوم گھوروں پر
سیہ مشین کا بھورا دھواں کھجوروں پر
ندی اُداس، ہوا درد ناک، بن خاموش
زمیں فسوں بہ بغل، آسماں فسانہ بدوش
دو رُویہ تار کے کھمبوں پہ ایک پرتوِ راز
ندی کے موڑ پہ صحرا نشیں دیئے کا گداز

دیئے کی لَو، جو ہواؤں سے جھلملاتی ہے
فروغِ عمرِ گزشتہ کی یاد آتی ہے

نگارخانہ

ایں است کہ دل بُردہ و خُوں کردہ بسے را
بسمِ اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را

انتظار کے دن

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

اُٹھتی جوانی

یار پری چہرہ

حُسنِ مخمور

رُوپ ہتی

گنگا کے گھاٹ پر

فتنۂ خانقاہ

اِنتظار کے دِن

صبا ادب سے یہ کہنا کہ ہیں بہار کے دن
شرابِ سُرخ کی راتیں ہیں، لالہ زار کے دن

زمانہ رقص میں ہے، روزگار نغمہ سرا
مگر خموش ہیں اِس تیرہ روزگار کے دن

ترے خیال میں گریاں ہیں، تیری یاد میں گم
یہ ماہتاب کی راتیں یہ آبشار کے دن

فرازِ کوہ سے پھُوٹے ہیں نو بنو چشمے
پھرینگے اب بھی نہ کیا چشمِ اشکبار کے دن

تجھے خبر ہو تو کیوں کر کہ کِن بلاؤں میں ہیں؟
گزُر رہے ہیں ترے شاعرِ بہار کے دن

خدا گواہ کہ کاٹے سے اب نہیں کٹتیں
یہ انتظار کی راتیں یہ انتظار کے دن

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

۱۹۲۵ء

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا
رین کا جاگا، نیند کا ماتا
نیند کا ماتا، دھوم مچاتا
انگڑائیاں لیتا، بل کھاتا
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

رُخ پہ سُرخی، آنکھ میں جادو
بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون، سمٹے ابرو
نیچی نظریں، بکھرے گیسو
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

نیند کی لہریں گنگا جمنی
چلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا، مسکی ساری
ہلکی مہندی، دُھندلی بندی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

ڈوبا ہوا رُخ، تابانی میں — انوارِ سحر پیشانی میں
یا آب گہر طغیانی میں — یا چاند کا مکھڑا پانی میں

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

رُخسار پہ موجِ رنگینی — چھٹکی چاندنی، سچی چینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی — مکھڑے پہ سحر کی شیرینی

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

آنکھ میں غلطاں عشرت گاہیں — نیند کی سانسیں جیسے آہیں
بکھری زُلفیں عُریاں باہیں — جان سے ماریں جس کو چاہیں

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل — اُلجھا اُلجھا زُلف کا بادل
نازک گردن، پھول سی ہیکل — سُرخ پپوٹے نیند سے بوجھل

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

کچھ جاگ رہی کچھ سوتی ہے — ہر موجِ صبا مُنہ دھوتی ہے
ناشستہ رُخ یا موتی ہے — انگڑائی سے جز بز ہوتی ہے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

چہرہ پھیکا نیند کے مارے — پھیکے پن میں شہد کے دھارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے — دھرتی ماتا بوجھ سہارے
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟
ہلچل میں دل کی بستی ہے — طوفانِ جنوں میں ہستی ہے
آنکھ میں شب کی مستی ہے — اور مستی دل کو ڈستی ہے
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

اُٹھتی جوانی

نئی ہے نام خُدا جوانی نئی اُمنگیں نیا زمانہ
جبیں پہ سازِ طرب کی موجیں
نگاہ میں سوزِ شاعرانہ
دِلوں پہ مارے ہوئے ہے شبخُوں لہو سے ہے سُرخ چشمِ میگوں
ہر اک اشارے میں ایک افسوں
ہر ایک چشمک میں اک فسانہ
نفس میں پھُولوں کی سی مہک ہے جبیں پہ خورشید کی دمک ہے
کمر میں تلوار کی لچک ہے
نظر میں بجلی کا آشیانہ

جلو میں مستی و ہوشیاری طواف میں کائنات ساری
جمال کی زد پہ ذوقِ باری
نظر میں شانِ پیمبرانہ

جبیں پہ چہرے پہ نورِ شبنم گداز شانوں پہ زلفِ برہم
ہر ایک موجِ نفس میں پیہم
بلندیوں کی طرف روانہ

ہر اک قدم فتنہ و تلاطم نیاز مندی میں بھی تحکّم
پلک جھپکنے میں اک تبسّم
نظر اُٹھانے میں اک ترانہ

جو چاہیں صہبائے مشک بو میں تمام عالم کو غرق کر دیں
یہ سُرخ ڈورے یہ مست آنکھیں
کھلا ہے جن میں شراب خانہ

سدھی ہوئی اس غضب کی پلکیں کہ آنکھ ملتے ہی دل میں ڈوبیں
منجھی ہوئی اس بلا کی چٹکی
کبھی نہ خالی گیا نشانہ

سکوت میں لحنِ دل ربائی خطاب میں شانِ کبریائی
جدھر چلی، چل پڑی خُدائی
جدھر مُڑی، مُڑ گیا زمانہ

وہ رُخ پہ طوفانِ کیفِ شب کے کہ لے کے انگڑائی مُنہ اندھیرے
مَلے جو آنکھیں ہتھیلیوں سے
ٹپک پڑے بادۂ شبانہ

درِ صنم پر، خُدائے اُلفت قبول فرما مری عبادت
نہ دے مجھے مسجدوں کی دعوت
کہ دین میرا ہے شاعرانہ

یار پری چہرہ

١٩٣٣ء

وہ یار پری چہرہ کہ کل شب کو سدھارا — طوفاں تھا، تلاطم تھا، چھلاوا تھا، شرارا
گُل بیز و گہر ریز و گہر بار و گہر تاب — کلیوں نے جسے رنگ دیا، گُل نے سنوارا
نوخاستہ و نورس و نوطلعت و نوخیز — وہ نقش جسے خود یدِ قدرت نے اُبھارا
خوں ریز و کم آمیز و دل آویز و جنوں خیز — ہنستا ہُوا مہتاب، دمکتا ہوا تارا
خوش چشم و خوش اطوار و خوش آواز و خوش اندام — اِک خال پہ قربان سمرقند و بُخارا!
گُل پیرہن و گُل بدن و گُل رُخ و گُل رنگ — ایماں شکن، آئینہ جبیں، انجمن آرا
صبحِ گلِ نوخاستہ و شامِ شگوفہ — مر رہنے کا سامان، تو جینے کا سہارا
آئینۂ رُخسار پر اک خالِ سیہ تاب — پیشانیِ گل رنگ پہ آنچل کا کنارا
آنکھوں کے چمکنے میں تقاضائے تلطّف — پلکوں کے جھپکنے میں تمنّائے مُدارا
وہ لب کہ مہِ نو کی دھڑکنے لگے چھاتی — وہ آنکھ کہ موتی کو نہ ہو صبر کا یارا
کلیوں کی نمائش میں اگر ہو متبسّم — ہو اُس کے ہی ہونٹوں کی طرف کثرتِ آرا

نظریں جو اُٹھا دے تو لرزنے لگے خورشید
ابرو کو جو بل دے تو ہو مہتاب دو پارا

اللہ ری ملبوس کی تابش شبِ مہ میں
سلما جو دمکتا تھا، چمکتا تھا ستارا

تھا میری نگاہِ طرب آموز کا پابند
رنگِ لب و رُخسار کا چڑھتا ہوا پارا

صندل کی دمک تھی عرق آلودہ جبیں پہ
یا مہرِ گلستاں میں تڑپتا ہوا تارا

نغموں کے تلاطم سے تھا جنبش میں لبِ لعل
لہروں کے تھپیڑوں میں تھا دریا کا کنارا

ہر سانس میں اپنے ہی پہ پیچیدہ جوانی
ہر گام پہ بکھری ہوئی زُلفوں کا نظارا

اِس طرح تبسّم میں تحکّم کی گھلاوٹ
جس طرح مئے تند کی تلخی ہو گوارا

کاکل کے خم و پیچ سے افشاں کا جھلکنا
ظلمات سے تھا چشمۂ حیواں کا اشارا

سرشار جوانی تھی کہ اُمڈے ہوئے بادل!
شاداب تبسّم تھا کہ جنّت کا نظارا

زُلفیں تھیں کہ ساون کی مچلتی ہوئی راتیں
شوخی تھی کہ سیلاب کا مڑتا ہوا دھارا

رُخ بات کا اقرار سے انکار کی جانب
جس طرح ہرن دشت میں بھرتا ہوا ترارا

اللہ کرے وہ صنمِ دُشمنِ ایماں
مچلے کسی شب جوش کے پہلو میں دوبارا

حُسنِ مخمُور

الاماں، پھر وہ نگاہِ مست، غرقِ ناز ہے
انکھڑیوں میں نغمہ ہے، دستِ مژہ میں ساز ہے

ہو رہی ہے صُبح، پھر بھی رُخ پہ ہے شب کا سُرور
انتہا میں ابتدا - انجام میں آغاز ہے

اللہ اللہ قامتِ بالا کا بے پایاں غرُور
عرش و کُرسی کی بلندی، فرشِ پا انداز ہے

اِس طرف چلتا نہیں بس، لغزشِ مستانہ سے
اُس طرف چتون میں خوفِ انکشافِ راز ہے

کاکُلیں رہ رہ کے یوں لہرا رہی ہیں دوش پر
تُو کہے، لیلائے شب، آمادۂ پرواز ہے

بستۂ ذوقِ سماعت ہے نظامِ کائنات
انکھڑیوں میں یوں درِ حرف و حکایت باز ہے

زُلف کی ژُولیدگی ہے راوئ طوفانِ شب
سُرخیِ لب، مستیِ دوشینہ کی غمّاز ہے

کیوں نہ غلطاں ہوں کلامِ جوش میں رنگینیاں
جوش، طفلی سے ہے رند، اور رندِ شاہد باز ہے

رُوپ متی

رُخسار میں شمعِ کعبہ کی ضَو
آنکھوں میں چراغِ دَیر کی لَو
خوش پیکر و خوش جمال و خوش رُو
چھٹکی ہُوئی چاندنی لبِ جُو
پلکوں کی جھپک میں مُسکراہٹ
شعلے کی خفیف تھرتھراہٹ
برسات کی راگنی کی راتیں
غلطیدہ حسین دست و پا میں
انفاس میں کمسنی کی خوشبُو
بنگال کا انکھڑیوں میں جادُو

چہرے پہ شباب کا تلاطُم
بُت خانے کی صُبح کا تبسُّم
عارض میں دمک، دمک میں نُدرت
برسات کے چاند کی لطافت
رَس کی بُوندیں کہ نرم باتیں!
آواز میں مالوے کی راتیں!

گنگا کے گھاٹ پر

بڑھائے سُرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آرہا ہے گنگا سے

ہرا دُلائی کا سَر پہ، نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل، بدن چرائے ہوئے

لبوں پہ مُہرِ خموشی، خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ، جبیں پہ دمک، نظر میں شراب

قدم قدم پہ تمنّائیں دلستانی کی
رُخِ شگفتہ پہ طُغیانیاں جوانی کی

شرابِ ناب لئے نرگسی کٹوروں میں
لہو چمن کا رواں سُرخ سُرخ ڈوروں میں

دراز زُلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں مدھ
نسیمِ صبح بنارس، ہلالِ شام اودھ

ہوائے صُبح سے روشن چراغِ سیم تنی
شگفتہ، غسلِ سحر سے مزاجِ گل بدنی

نظر نہ آئے وہ چہرے پہ چادرِ آبی
بیاضِ چشم میں گل کاریٔ شکر خوابی

خنک نسیم سے اُبھرے ہوئے نقوشِ شباب
صباحتیں ہیں کہ برسات کی شبِ مہتاب

عجیب حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے　　مہک رہا ہے بدن کمسنی کی خوشبو سے
مقابلہ جو کرے کوئی چاند پھیکا ہے　　جبینِ شوخ پہ صندل کا سرخ ٹیکا ہے
نمی ہے زلف میں، اشنان کر کے نکلی ہے　　یہ کس کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے
لبوں پہ کھیل رہا ہے اثر نہانے کا　　گمان ہوتا ہے ہر بار مسکرانے کا
سیاہ زلف پہ آنچل خفیف آبی ہے　　برہنہ پا ہے تو ہر نقشِ پا گلابی ہے
مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرمِ خطاب　　کہ وقتِ صبح ہے اے دخترِ شبِ مہتاب

ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں
ادھر بھی ایک نظر، میں ترا پجاری ہوں!

فتنۂ خانقاہ

اک دن جو بہرِ فاتحہ اِک بنتِ مہروماہ
پہنچی نظر جھکائے ہوئے سُوئے خانقاہ
زُہّاد نے اُٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں میں دب کے ٹُوٹ گئی ضربِ لاالٰہ

برپا ضمیرِ زُہد میں کہرام ہوگیا
ایماں، دِلوں میں لرزہ براندام ہوگیا

یُوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں
جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دِل کہ رُوح سے اُٹھنے لگا دھواں
ہلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں

پرتوفگن جو جلوۂ جانانہ ہوگیا
ہر مُرغِ خُلد، حُسن کا پروانہ ہوگیا

اُس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں، نہ پُوچھ
نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں، نہ پُوچھ
رُخ پہ ہوائے شام کی گُل باریاں، نہ پُوچھ
کاکل کی ہر قدم پہ فسُوں کاریاں، نہ پُوچھ

عالم تھا وہ خرام میں اُس گُلعذار کا
گویا نزُولِ رحمتِ پروردگار کا

گردن کے لوچ میں، خمِ چوگاں لیے ہوئے
چوگاں کے خم میں گوئے دل و جاں لیے ہوئے
رُخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لیے ہوئے
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لیے ہوئے

آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لَو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ، عشوۂ آہن گداز کی
لہریں، ہر ایک سانس میں، سیلابِ ناز کی
پلٹیں ہوا کے دوش پہ، زلفِ دراز کی
آئینے میں دمک، رُخِ آئینہ ساز کی

آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر، کاکلِ شبگوں کے دام میں
موجیں شرابِ سُرخ کی آنکھوں کے جام میں
رنگِ طلوعِ صبح، رُخِ لالہ فام میں
چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں

انساں تو کیا، یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈوبی ہوئی تھی جنبشِ مژگاں شباب میں
یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق، کہ نمی تھی گلاب میں
یا اوس موتیے پہ شبِ ماہتاب میں

آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یُوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

ہات اُس نے فاتحہ کو اُٹھائے جو ناز سے
آنچل ڈھلک کے رہ گیا زُلفِ دراز سے
جادُو ٹپک پڑا نگہِ دِل نواز سے
دِل ہِل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اِک سمت پھر گئی
اِک پیر کے تو ہات سے تسبیح گر گئی

فارغ ہُوئی دُعا سے جو وہ مشعلِ حرم
کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم
انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم
انگڑائی فرطِ شرم سے یُوں ٹوٹنے لگی
گویا صنم کدے میں کرن پھُوٹنے لگی

ہر چہرہ چیخ اُٹھا کہ ترے ساتھ جائیں گے
اے حُسن! تیری راہ میں دھُونی رمائیں گے
اب اِس جگہ سے اپنا مصلّےٰ اُٹھائیں گے
قربان گاہِ کُفر پہ ایماں چڑھائیں گے
کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے تری بارگاہ میں

سُورج کی طرح زُہد کا ڈھلنے لگا غرور	پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرور	رُخ کی جوان لَو سے پگھلنے لگا غرور
ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زُہد سُرخ ہوئی اور گل گئی

پل بھر میں زُلفِ لیلیٰ تمکیں بگڑ گئی	دَم بھر میں پارسائی کی بستی اُجڑ گئی
جس نے نظر اُٹھائی، نظر رُخ پہ گڑ گئی	گویا ہر اِک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی
طُوفانِ آب و رنگ میں زہّاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد حدودِ عشقِ خُدا سے نِکل گئے	انساں کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حُسن کی گرمی سے جل گئے	کِرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصّہ دین، کُفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بُت خانہ ہو گیا

واردات

(بنامِ شاہدِ نازک خیالاں)

پہلی مفارقت

شامِ رخصت

عقدۂ لاینحل

تیرے لئے

عاشق نواز

چاند کے انتظار میں تارے

تو اگر واپس نہ آتی

بیتے ہوئے دن

تعاقب

پہلی مفارقت

چاند سے عہدِ وصل کی باتیں
ہائے فرقت کی چاندنی راتیں
آفتیں جمع ہیں جُدائی کی
چاندنی رات ہے جُدائی کی
کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے
رات بھر دل میں درد ہوتا ہے
اُٹھتی رہتی ہیں بار بار آنکھیں
ڈھونڈتی ہیں جمالِ یار آنکھیں
کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو
نیند آتی نہیں کسی پہلو
چھیڑتا ہے جو کوئی رات کو ساز
صاف آتی ہے یار کی آواز
آگ سی پہلوؤں میں جلتی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے
مُرغ جب صُبح کو جگاتے ہیں
چونکتے ہی وہ یاد آتے ہیں
شغلِ مرگ و حیات کی راتیں
ہائے وہ التفات کی راتیں
بے نتیجہ ہے صبر کی تلقین
بلکہ دیتا ہے جب کوئی تسکین
شعلۂ غم بھڑکنے لگتا ہے
اور بھی دِل دھڑکنے لگتا ہے

ہر نفس آہ، ہر سخن نالہ — سَم ہے آبِ ہوائے بنگالہ
اے اودھ کی نسیمِ عُقدہ کشا — وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں — آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں
اُٹھتی رہتی ہے ہُوک سی پیہم — ہائے وہ رُخ، وہ کاکلِ برہم
ہائے وہ چاندنی، وہ مہتابی — مست آنکھوں کی وہ شکر خوابی
برگِ گل پر وہ ماہتاب کی ضَو — رُخ پہ وہ آمدِ شباب کی رَو
خال و خد سے عیاں بصد انوار — صُبحِ صادق کی چاندنی کا نکھار
ہاں تو اے دِلنشیں اودھ کی صبا — وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں — آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں
ایک مُدت ہُوئی نہیں دیکھا — ہائے تیرا وہ چاند سا مُکھڑا
اس طرح صُبح و شام ہوتی ہے — دل دھڑکتا ہے آنکھ روتی ہے
کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو — آگ لگ جائے ایسے جینے کو

تنگ ہے سانس آنے جانے سے
اب بُلا لے کسی بہانے سے

شامِ رُخصت

تجھ سے رُخصت کی وہ شامِ اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اُداسی، وہ فضائے گریہ ساماں، ہائے ہائے
وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش، الاماں!
وہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں ہائے ہائے
وہ مرا عشقِ گل افشاں، رشتہ بر پا حیف حیف
وہ ترا حُسنِ جواں، سر در گریباں، ہائے ہائے
وہ مرے چہرے پہ دُودِ غم کے بادل الاماں
وہ تری پلکوں پہ اشکوں سے چراغاں ہائے ہائے
وہ مرے اطوار میں اندازِ سیلِ بے پناہ
وہ تری آواز میں آثارِ طوفاں، ہائے ہائے
وہ جُدائی کی ہوا کے تند جھونکے وائے غم
وہ جوانی کا چراغِ زیرِ داماں ہائے ہائے

اِس طرف اُلجھی ہوئی موجِ حیاتِ یک نفس
اُس طرف بکھرے ہوئے گیسوئے تاباں ہائے ہائے

اِس طرف تاریکیٔ شامِ مریضانِ کہن!
اُس طرف آلام صبحِ سوگواراں ہائے ہائے

طاقِ عبرت، اور میری شمعِ ہستی، حیف حیف
ہالۂ غم، اور تیرا ماہِ تاباں، ہائے ہائے

یاں چمکتے ہی پہ برقِ نالۂ درد آفریں!
واں برسنے ہی پہ ابرِ چشمِ حیراں ہائے ہائے

یاں، ہر اک تارِ نظر۔ زنجیرِ پائے عافیت
واں، ہر اک موجِ نفس۔ دیوارِ زنداں ہائے ہائے

یاں، لبوں پہ جنبشِ آہِ تُنک جاں، وا نصیب
واں، مژہ میں لرزشِ اشکِ گریزاں ہائے ہائے

حسرتِ دیدار یاں ہر آن بیتاب و شدید
فرصتِ نظّارہ واں بھیم پر افشاں، ہائے ہائے

یاں، لرزتا سا غرورِ عزم و ہمّت، الحذر
واں، جھجکتی سی نگاہِ فتنہ ساماں، ہائے ہائے
یاں، کفِ پا چوم لینے کی بجھی سی آرزو
واں، بغل گیری کا شرمایا سا ارماں، ہائے ہائے
تمتماتے ولولوں کی آگ، اور تیری جبیں
سنسناتی آنچ، اور میرا گلستاں، ہائے ہائے
مَیں سراپا سازِ عشرت، اور رہینِ درد و غم
تو مجسّم نازکی، اور بارِ حرماں، ہائے ہائے
وہ مِری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت، وائے شوق!
وہ تِری آنکھوں میں کچھ سُننے کا ارماں، ہائے ہائے
اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا
"جوشؔ" میرا دل ہوا جاتا ہے ویراں، ہائے ہائے
اے فغاں بر لب ترنّم، اے خزاں بر کفِ بہار
جوشؔ تیرے دل کی ویرانی کے قرباں، ہائے ہائے

عقدۂ لاینحل

درسِ عبرت ہے یا اولی الابصار — میرا افسانۂ دلِ بیمار
یہ فسانہ نہیں، حقیقت ہے — "شاعری سے نہیں مجھے سروکار"
دل میں ہیں جذبات گوناگوں — اُلجھی جاتی ہے کاکلِ گفتار
کم پڑی ہوگی نوعِ انساں پر — جس مصیبت سے آج میں ہوں دوچار

اُس طرف حسن، خودسر و خود بیں — اِس طرف عشق، ضابط و خوددار
اُس طرف ناز و دلبری کا شکوہ — اِس طرف شعر و بیخودی کا وقار
اُس طرف حسن، غرقِ صد نخوت — اِس طرف عشق، محوِ صد پندار
اُس طرف شوخیوں میں بھی تمکین — اِس طرف اضطراب میں بھی قرار
اُس طرف بے رُخی ہے درماں سے — اِس طرف ہے پرستشِ آزار

اُس طرف چارہ گر ہے بے پروا — اِس طرف بے نیاز ہے بیمار
اُس طرف اعتبارِ عشوہ و ناز — اِس طرف اعتمادِ صبر و قرار
اُس طرف کیفِ نرگسِ مخمور — اِس طرف دَورِ بادۂ اشعار
اُس طرف عہد ہے نہ سُننے کا — اِس طرف بند ہیں لبِ گفتار
کہنے جاؤں تو وہ سُنیں نہ داد — سُننے آئیں تو میں کروں اظہار
مجھکو یہ کد، وہ ہوں تبسّم ریز — اُن کو یہ ضد کہ یہ کرے اصرار

یہ رَوِش ترک بھی اگر کر دوں — ایک عُقدہ ہے اور بھی دُشوار
فرض کیجئے اُسے بھی سُلجھا دُوں — گتھّیاں اور بھی تو ہیں دو چار
مُدّعا ہے غرض وہ پیچیدہ — کہ دُعا مانگنا بھی ہے دُشوار

مجکو وصل و فراق دونوں رسَن — مجکو تریاق و زہر، دونوں دار
عہدِ اخلاص توڑنے میں بھی ننگ — رشتۂ شوق جوڑنے میں بھی عار
اُن کا آنا، بلائے ہوش و خرد — اُن کا جانا، وداعِ صبر و قرار

اُن سے ملیئے تو عافیت برباد
اُن سے کھنچیئے تو زندگی بیکار
اُن کی وابستگی بھی سوزِ جحیم
اُن کی بیگانگی بھی شعلۂ ناز
اُن کا پردا بھی موجبِ ایذا
اُن کا جلوہ بھی باعثِ آزار
اُن کی دُوری بھی خنجرِ خُوں ریز
اُن کی قربت بھی دشنۂ خونخوار
اُن کے کھونے پہ بھی نہیں راضی
اُن کے پانے پہ بھی نہیں تیار
کون سمجھے گا ان معمّوں کو
عشق ہی مست عشق ہی ہُشیار
عشق ہی ہجر کے لئے بے چین
عشق ہی وصل کے لئے بیمار
عشق ہی قدر دانِ حجلۂ نُور
عشق ہی مدح خوانِ گوشۂ تار
عشق ہی راہِ سعی میں خفتہ
عشق ہی بزمِ فکر میں بیدار
کس قدر ہیں عمیق یہ باتیں
کس قدر ہے عجیب یہ گفتار
کون سمجھے گا اِن معمّوں کو
دُور ہیں آہ محرمِ اسرار

اس طرف تو یہ کشمکش دل میں
اور اُدھر ہے یہ رنگِ لیل و نہار
اک طرف زاہدوں کی مجلس میں
میری غیبت کا گرم ہے بازار

اِک طرف عاقلوں کی محفل سے
سخنِ ناروا کی ہے بوچھاڑ

قابلِ مضحکہ مرے انداز
درخورِ سرزنش مرے اطوار

گوش، پامالِ طعنۂ احباب
چشم، مجروحِ خندۂ اغیار

راہزن جمع، راہبر ناپید
رات تاریک، راہ ناہموار

آنکھ نمناک، راستے خس پوش
نُور خوابیدہ ظلمتیں بیدار

جلوے معدوم، زمزمے مفقود
چشم خوننابہ ریز، گوش فگار

وضعِ اہلِ وطن، معاذ اللہ
تہمتوں کے لگا دیئے انبار

غُربت افسردگی، وطن کلفت
غیر بے حس عزیز ناہنجار

کس سے جا کر کہے کوئی احوال
کس سے جا کر کرے کوئی اظہار

اہلِ ظاہر، مجھے خس و خاشاک
اہلِ باطن، مجھے در و دیوار

بند ہے مجھ پہ فیضِ دیر و حرم
تنگ ہیں مجھ سے کافر و دیندار

سخت ہیں مجھ پہ کُفر کے آئین
تیز ہے مجھ پہ شرع کی تلوار

اک طرف موت، ایک جانب زیست
وہ بہت سہل، یہ بہت دشوار

ہر سخن آگ، ہر نفس بجلی
"وقنا ربنا عذاب النار"

تیرے لئے

دیکھ کیونکر جی رہا ہوں دلربا تیرے لئے
ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لئے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لئے

میں کہ آغوشِ سکوں میں پا چکا تھا آپ کو
پھر محیطِ کشمکش میں کھو گیا تیرے لئے

حسرتیں دل کی رواں ہیں کارواں در کارواں
ہر نفس ہے ہجر میں بانگِ درا تیرے لئے

آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابن رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لئے

مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لئے

شرع سے درخواست کرتا ہوں کشودِ کار کی
کھٹکھٹاتا ہوں درِ دارالقضا تیرے لئے

آہ اک فتوے کی خاطر کہنا پڑتا ہے مجھے
"شیخ" سے نااہل کو "مردِ خدا" تیرے لئے

جاہلانِ بے خرد کے ناسزا اقوال کو
ماننا پڑتا ہے بے چون و چرا تیرے لئے

چاک کر کے ہیں نے آبائی امارت کا لباس
زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے

مشتری حسن کا خدا تھا، چند سکّوں کے عوض
بیچ دی ہیں نے وہ جنسِ بے بہا تیرے لئے

پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لئے

کر چکا ہوں شدّتِ حرماں سے تنگ آ کر معاف
ہر فرومایہ کو اپنا خوں بہا تیرے لئے

پوجنا پڑتا ہے ہر کافر کو تیرے واسطے
ماننا پڑتا ہے ہر بُت کو خدا تیرے لئے

آہ جو فرشِ حرم پر بھی کبھی جھکتا نہ تھا
ہیں نے بتخانے ہیں وہ سر رکھ دیا تیرے لئے

شرط پوری ہو چکی، للّٰلہ اب تو رحم کر
دیکھ کیا تھا جوشؔ، اور کیا ہو گیا تیرے لئے

عاشق نواز

میری پرسش اور تیری بزمِ ناز
آفریں اے شاہدِ عاشق نواز

میں سراپا خاک، اور میرے لئے
سلسلہ جنبانیِ راز و نیاز

اِک مرے دل کی تسلی کے لئے
زلزلے میں آئے اور تمکینِ ناز

تیری طبعِ ناز اور آشفتگی
تیرا پہلو، اور خراشِ جاں گداز

یہ تیرا رُخ اور رنگِ خستگی
یہ ترے لب اور حدیثِ سوز و ساز

تیرا سینہ، اور میری آرزو
میری محفل، اور تیری شمعِ ناز

تیرا دل، اور کاہشِ سوزِ نہاں
تیرا سر، اور زانوئے سوز و گداز

آہِ سوزاں، اور تیرے لعلِ لب
اشکِ خونیں، اور تیری چشمِ ناز

خارِ حسرت، اور ترا قلبِ رقیق گردِ حرماں، اور تری زُلفِ دراز
تیرا دامن، اور وقفِ اشکِ غم تیرا سینہ، اور بارِ حرفِ راز
آہ وہ اور اس طرح جُھک کر ملے خُود اُٹھاتی ہو جوانی جس کے ناز
جس کے قدموں پر ہو خُود فطرت کا سر وہ پڑھے، اور مجھ سے مِلنے کو نماز

اُس کے دِل سے پوچھیے غم کا مزا "دل شکن" جسکے لئے ہُو "دِل نواز"

مُفت دو جانیں تلف ہونے کو ہیں سُن رہا ہے اے خدائے بے نیاز
مہرباں ہو اے انیسِ بے کساں رحم فرما اے کریمِ کارساز

ابر میں ہے سنگباری کی گرج
آئینوں کو دیکھ اے آئینہ ساز

چاند کے اِنتظار میں تارے

کِس نے وعدہ کیا ہے آنے کا — حُسن دیکھو غریب خانے کا
رُوح کو آئینہ دکھاتے ہیں — در و دیوار مُسکراتے ہیں
آج "گھر" بنا ہے پہلی بار — دِل میں ہے خوش سلیقگی بیدار
غرق ہے روح خوش جمالی میں — نظم ہے طبعِ لااُبالی میں
جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا — خوف دل میں فریبِ قسمت کا
سوزِ قلبِ کلیم آنکھوں میں — اشکِ اُمّید و بیم آنکھوں میں

چشم بر راہ، شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے

رات بھیگی، شگفتہ ہار ہوا — رنگ کلیوں میں آشکار ہوا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں مچلی — ہلکی ہلکی مہک چنبیلی کی
وعدہ، جنجال بن گیا جی کا — رنگِ اُمید ہو چلا پھیکا

اِک جہاں چشمِ تر میں گرد ہوا　　دل وہ دھڑکا کہ رنگ زرد ہوا

دفعتہً اِک چمک سی دَوڑ گئی
بام و دَر پر جھلک سی دوڑ گئی

دِل میں چمکی اُمید کی بجلی　　اُنگلیاں اور ہو گئیں ٹھنڈی
الاماں شوقِ دید کی یورش　　بڑھ گئی اور خون کی گردش

اپنی حدِّ وفا ہُوئی محسُوس
اُن کی آوازِ پا ہُوئی محسُوس

چھا گئی بام و در پہ رعنائی　　دِل میں لی ولولوں نے انگڑائی
جل اُٹھی شمع، دِل کے مجلس میں　　صُبح گویا ہوئی بنارس میں
فرطِ شادی سے بو کھلا سا گیا　　دل میں احساسِ شادمانی کا
تارِ نظروں کے دمبدم کانپے　　لڑکھڑائی زباں، قدم کانپے
نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا　　رشتہ سمٹا مری نگاہوں کا

آئے وہ، اشک تھم گئے بارے
چاند نکلا، سُبک ہُوئے تارے

تو اگر واپس نہ آتی

تُو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دِن تک دُھواں اُٹھتا بُطونِ خاک سے
ہات آجاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں
دِل پہ کیا کچھ بیت جاتی اُس اندھیری رات میں
اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تُندِ باراں، وہ خروشِ برق و رعد[ل]
دفعتہً وہ روشنی کے سِلسلے کا ٹُوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھُوٹنا

ل "باد" اور "رعد" کا قافیہ میرے نزدیک دُرست ہے

وُہ "اَپالو" کے کلیجے کی مچلتی" مان سُون"
وُہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جُنون
اور اُس طوفان میں اے زِندگی کی روشنی
کُود پڑنا وہ سمندر میں ترا یکبارگی

تُو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دِن تک دُھواں اُٹھتا بُطونِ خاک سے
اس دِلِ سوزاں میں آتے اِس بَلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے
مَوت، اور پھر مَوت تیری، الحفیظ و الاَماں
ہڈّیوں سے آنچ اُٹھتی، اور بالوں سے دُھواں

لیکن اِک لمحے کے بعد اے پیکرِ حُسن و حیات
جوشؔ کو بھی کاوشِ ہستی سے مِل جاتی نجات

پہلے ہوتا اِک تلاطُم ایک طوفاں ایک جوش
بعد ازاں تُو اور مَیں اور بحر و باراں کا خروش
اِتّصالِ رُوح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

بحر کے سینے کو جب طُوفان میں لاتی ہوا
پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کُوکتے
نُور میں پلٹے ہُوئے دونوں اُبھرتے بحر سے
رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جُھک جاتا قمر
سیر کرتے روز ہم بانہیں گلوں میں ڈال کر
کوئلیں جب کُوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صُبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں

چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر دُھندلی سی دوپرچھائیاں
زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم
سانس لیتے سازِ حُسن و عشق کے تاروں میں ہم
وقف ہو جاتے محبّت کے فسانے کے لئے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لئے

بِیتے ہُوئے دِن

کیا حال کہیں اُس موسم کا — جب جِنسِ جوانی سستی تھی
جِس پھُول کو چُومو کھِلتا تھا — جِس شے کو دیکھو ہنستی تھی
جینا، سچّا جینا تھا — ہستی، عینِ ہستی تھی
افسانہ، جادُو، افسوں تھا — غفلت، نیندیں، مستی تھی

اُن بیتے دِنوں کی بات ہے یہ
جب دل کی بستی بستی تھی!

غفلت، نیندیں، مستی تھی — آنکھیں کیا پیمانے تھے
ہر روز جوانی بِکتی تھی — ہر شام و سحر بیعانے تھے

ہر خار میں اِک بُت خانہ تھا — ہر پھول میں سو میخانے تھے
کالی کالی زُلفیں تھیں — گورے گورے شانے تھے

اُن بیتے دِنوں کی بات ہے یہ
جب دِل کی بستی بستی تھی

گورے گورے شانے تھے — ہلکی پُھلکی بانہیں تھیں
ہر گام پہ خلوت خانے تھے — ہر موڑ پہ عشرت گاہیں تھیں
طُغیانِ خُوشی کے آنسو تھے — تکمیلِ طرب کی آہیں تھیں
عشوے، چُہلیں، غمزے تھے — پیتیں، خوشیاں، چاہیں تھیں

اُن بیتے دِنوں کی بات ہے یہ
جب دِل کی بستی بستی تھی

تعاقب

"مرد ہو عشق سے جہاد کرو"
"اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو"
"دل سے بیتے دنوں کی یاد مٹاؤ"
"نہ تو اب خود ہی رو نہ مجھ کو رلاؤ"
"بھول جاؤ کہی سنی باتیں"
"نہ تو وہ دن ہیں اب نہ وہ راتیں"
"اب نہ وہ موڑ ہیں نہ وہ گلیاں"
"اب نہ وہ پھول ہیں نہ وہ کلیاں"
"اب جہاں سے گزر چکی ہوں میں"
"اب یہ سمجھو کہ مر چکی ہوں میں"
"ایک دکھیا کو اور اب نہ ستاؤ"
"بن پڑے تو مری گلی میں نہ آؤ"
"مرد ہو عشق سے جہاد کرو"
"اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو"

میرے کانوں میں میرے سینے میں
گونجتی رہتی ہیں یہ آوازیں
جس طرف جاؤں دل ہلاتی ہیں
یہ مرے ساتھ ساتھ جاتی ہیں

بادِ جاں بخش سے بگولوں سے
سخت کانٹوں سے نرم پھولوں سے
یہ صدائیں برابر آتی ہیں!
دل کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں
"بھول جاؤ کہی سُنی باتیں!"
"نہ تو وہ دن ہیں اب نہ وہ راتیں!"
"مَرد ہو عِشق سے جہاد کرو"
"اَب مجھے بھول کر نہ یاد کرو"
تنگ آکر جدھر بھی جاتا ہُوں
اِن صداؤں کو ساتھ پاتا ہُوں
صحنِ گیتی سے اوجِ گردوں سے
تابِ انجم سے آبِ جیحوں سے
بحرِ موّاج کے حبابوں سے
حکمت و شعر کی کتابوں سے
شورِ شوں، غلغلوں و دھماکوں سے
تیز رَو گاڑیوں کے پہیّوں سے
شعر گوئی سے، شعر خوانی سے
ہر حقیقت سے، ہر کہانی سے
چوڑی سڑکوں سے، تنگ گلیوں سے
ہلتی شاخوں سے، کِھلتی کلیوں سے
شورِ جلوت، سکوتِ خلوت سے
جُنبشِ ضَو، جمُودِ ظلمت سے
معبدوں سے، شراب خانوں سے
مطربِ خوش نوا کی تانوں سے

بُوئے عنبر سے بادِ صرصر سے   رُوئے خُوباں سے، رنگِ مرمر سے
قصرِ مُنعم سے۔ قبرِ مفلس سے   پائے طاؤس و چشمِ نرگس سے
جانِ گوہر سے رُوحِ نسریں سے   موجِ سنبل سے، اوجِ پرویں سے
باغ سے، مدرسے سے، جنگل سے   تپتے سُورج، برستے بادل سے
یہ صدائیں برابر آتی ہیں   دل کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں

"بھُول جاؤ کہی سُنی باتیں"
"نہ تو وہ دن ہیں اب نہ وہ راتیں"
"ایک دُکھیا کو اور اب نہ ستاؤ"
"بن پڑے تو مری گلی میں نہ آؤ"
"اب جہاں سے گزر چکی ہوں میں"
"تُم یہ سمجھو کہ مر چکی ہوں میں"
"مردِ ہو، عشق سے جہاد کرو"
"اب مجھے بھُول کر نہ یاد کرو"

بادۂ سروش

(بنامِ حافظ)

قندِ پارس کا مزا ہے بہ زبانِ اُردو

حیّ علیٰ خیر العمل

یومِ بہار

دعوتِ کیف

ابدی شعلہ

خرابات

ساقی

چند جرعے

جہاں میں تھا

نمازِ صبوحی

کب آئیگا

نیازِ ناز

ہنوز

نقشِ خیال دل سے مٹایا نہیں ہنوز

ہنوز یاد ہے

تیرا عہدِ تمنّا

متفرق غزلیات

حیّ علیٰ خیر العمل

آ، ہمنشیں، نمازِ صبوحی ادا کریں
خوشبوئے عود میں درِ میخانہ وا کریں

ہاں اُٹھ کہ مُہرِ شیشۂ گُل رنگ توڑ کر
انسانیت کو دامِ خرد سے رہا کریں

باقی جو بچ رہا ہے کچھ ایمان، خیر سے
اُس کو بھی آج پائے صنم پر فدا کریں

پودے مچل رہے ہیں گھٹائیں ہیں پُر خروش
آ، ہم بھی آج حقِّ جوانی ادا کریں

بہکیں قدم قدم پہ، چلیں جھوم جھوم کر
اِتنا تو پاسِ خاطرِ موجِ صبا کریں

ساغر میں غرق کر کے لباسِ فریب کو
پیرانِ خرقہ پوش کے حق میں دُعا کریں

ہر شے ہے پائے لیلیٰ مستی پہ سجدہ ریز
اور ہم نمازِ جام و صُراحی قضا کریں

برسات کی گھٹاؤں سے برسیں گلابیاں　　اور ہم وضو سے شست و شوئے دست پا کریں
گلشن کا ذرّہ ذرّہ پئے بے دھڑک شراب　　اور ہم خیالِ پرسشِ روزِ جزا کریں
بہکے ہوا، رواں ہو فضا، مست ہو گھٹا　　اور ہم خرد کو راہبر و رہنما کریں
گردوں پیالہ کش ہے، تو گیتی قرابہ نوش　　ہم اور اس بہار میں خوفِ خدا کریں

پی پی کے، جھوم جھوم کے، گا گا کے مثلِ جوش
آ، دھوم سے عبادتِ آب و ہوا کریں

یومِ بہار

اے ہمنشیں! وہ جوشِ مئے ارغواں ہے آج
صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج

ہر غنچہ کہ رقص کناں ہے بہ طرزِ نو
چشم و چراغِ سلسلۂ قدسیاں ہے آج

جس پر نثار موجۂ تسنیم و سلسبیل
بکھری ہوئی وہ کاکلِ عنبر فشاں ہے آج

اللہ رے سیلِ نغمہ و طوفانِ رنگ و بو
موجِ ہوا میں جنبشِ نبضِ جواں ہے آج

شکرِ خدا کہ طرۂ طرفِ کلاہِ دوست
مشعل فروزِ مجلسِ روحانیاں ہے آج

پھر چہرۂ بشر پہ ہے رنگِ الوہیت
پھر فرشِ خاک پر سرِ کرّوبیاں ہے آج

اوجِ فلک پہ موجۂ ابرِ سبک خرام
صحنِ چمن میں جلوۂ سروِ رواں ہے آج

وہ دخترِ رز کہ تھی خمِ رنگیں میں معتکف
صد شکر صدرِ انجمنِ مے کشاں ہے آج

اُف ری شمیمِ کاکلِ شب رنگ و بوئے عود
دوشِ صبا پہ دولتِ باغِ جناں ہے آج

رندوں کے ساتھ رُوحِ دو عالم ہے رقص میں
یومِ طوافِ کعبۂ رطلِ گراں ہے آج

ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہِ ناز
"عین الیقیں" بہشت کا وہم و گماں ہے آج

زیرِ نگیں زمیں ہے، قبضے میں آسماں
آفاق پر حکومتِ پیرِ مغاں ہے آج

ہر خشک و تر میں گونج رہی ہیں حکایتیں
ہر ذرۂ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج

رہ رہ کے اُڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانئے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

اے جوشؔ زلزلے میں ہے قصرِ تعیّنات
دل ماورائے قیدِ زمان و مکاں ہے آج

دعوتِ کیف

وقتِ خُنک ہے شُغلِ مئے ارغواں کریں
آؤ دُعائے دولتِ پیرِ مُغاں کریں

اِک موجِ نغمہ فرش پہ ہو، ایک عرش پر
یُوں خُوں میں سفینۂ مے کو رواں کریں

ہو جائے آب آب برستی ہُوئی گھٹا
یوں آؤ صحنِ باغ میں جولانیاں کریں

حسبِ مزاج، دہر کو بخشیں حیاتِ نَو
حسبِ مُراد قاعدۂ آسماں کریں

یارو، رباب اُٹھاؤ کہ بُوندوں کی تال پر
مدحِ شرابِ کُہنہ و حُسنِ جواں کریں

جن مُعجزوں پہ کاوشِ قُدرت کو ہے غرُور
وہ مُعجزے بہ جُنبشِ رطلِ گراں کریں

ہاں پیش کر کے جوشؔ کو دُنیا کے سامنے
آؤ بلند رتبۂ ہندوستاں کریں؟

ابدی شعلہ

زباں ساکت ہے لیکن تر زبانی اب بھی ہوتی ہے
لبِ خاموش سے جادو بیانی اب بھی ہوتی ہے

حدیثِ نفس کی صورت میں اکثر خود بخود پہروں
زبانِ کیف کی افسانہ خوانی اب بھی ہوتی ہے

لبِ گُل رنگ کو ہوتی ہے جنبش جب تصوّر میں
سماعت کی زمیں پر گُل فشانی اب بھی ہوتی ہے

کبھی جب عہدِ رنگینی کی راتیں یاد آتی ہیں
عروسِ شوق کی پوشاک دھانی اب بھی ہوتی ہے

بایں طغیانِ حکمت کون مانے گا کہ اس دل پر
مُسلّط ہر بلائے آسمانی اب بھی ہوتی ہے

رسُولِ شادمانی ہوں مگر چھڑتے ہیں جب نغمے
نظر سے سوزِ غم کی ترجمانی اب بھی ہوتی ہے

خُدائے خندہ ہوں لیکن جب اُن کی یاد آتی ہے
مری آنکھوں سے اشکوں کی روانی اب بھی ہوتی ہے

ترانوں سے مری محفل کو گو فرصت نہیں ملتی
مگر تنہائیوں میں نوحہ خوانی اب بھی ہوتی ہے

بہ ایں مشقِ تحمّل، بارہا خاموش راتوں میں
کسی کی یاد مرگِ ناگہانی اب بھی ہوتی ہے

خرد کا دور ہے لیکن مرے کمبخت سینے میں
جنوں کی گاہے گاہے پرفشانی اب بھی ہوتی ہے

کسی کے روئے رنگیں کی صباحت کے تصوّر میں
چمن کی چاندنی اکثر سہانی اب بھی ہوتی ہے

وفورِ یاس سے گو دل رہینِ برف و شبنم ہے
کبھی پچھلے پہر آتش فشانی اب بھی ہوتی ہے

نہ جانے جوشؔ کس ارماں میں اب تک جان باقی ہے
کہ اکثر آرزوئے زندگانی اب بھی ہوتی ہے

خرابات

یہ خرابات ہے تقوے کا نہیں کام یہاں
عینِ طاعت ہے تماشائے لبِ بام یہاں

رقص کرتی ہے زمیں رات کی رنگینی میں
وجد کرتا ہے فلک صبح کے ہنگام یہاں

میکدے میں نہ ہو اے شیخِ حرم نکتہ فروش
کہ ازل سے نہیں گنجائشِ اوہام یہاں

اثرِ تربیتِ پیرِ مغاں کے قرباں
خارج از بحث ہے اندیشۂ آلام یہاں

شکرِ باری کہ علی الرّغمِ فقیہہِ خود بیں
حکمِ ایزد ہے کہ گردش میں رہے جام یہاں

میکدے کا ہے مشیّت کے اشاروں پہ مدار
جام در دست ہیں خود شرع کے احکام یہاں

طوطیِ قدس ہے اک رشتہ بپا صیدِ زبوں
طائرِ سدرہ ہے اک مرغِ تہِ دام یہاں

سایۂ زُلف سے ہے زینتِ دوشِ رنداں
ظلمتِ کفر سے ہے رونقِ اسلام یہاں

اثرِ بے بصری ہے طلبِ جاہ و نمود
ہدفِ مسخرگی ہے ہوسِ نام یہاں

گوشِ رندانِ قدح خوار ہے اور لعلِ نگار
لبِ جبریل نہیں درخورِ پیغام یہاں

کسی سورت میں بھی باقی نہیں جائے تاویل
کسی آیت میں بھی ممکن نہیں ابہام یہاں

شعلۂ عشق ہے اس راہ میں چڑھتی ہوئی دھوپ
مشعلِ عقل ہے خورشیدِ لبِ بام یہاں

منزلیں راہ میں تبدیل ہوا کرتی ہیں
رُو بہ آغاز ہی رہتا ہے ہر انجام یہاں

قیمتِ بادہ میں جو خرقہ کہ ہوتا ہے گرو
اُس پہ قربان ہیں سو جامۂ احرام یہاں

خوفِ عقبیٰ کی اُداسی کے عوض چہروں پر
کھیلتا ہے اثرِ بادۂ گلفام یہاں

اک توہّم ہے رہ و رسمِ شمارِ مہ و سال
اک تمسخر ہے نظامِ سحر و شام یہاں

ذرّے ذرّے پہ ہے اتنا ابدیّت کا جلال
وقت رہتا ہے سدا لرزہ براندام یہاں

گردِ رندانِ سیہ مست بصد عشوہ و ناز
حلقہ باندھے ہوئے رہتے ہیں گل اندام یہاں

خوابِ صد سالہ کے مانند ہے اے محرمِ راز
وقفۂ یک نفس و لغزشِ یک گام یہاں

لب ہلاتے ہی جو دنیا کو ہلا دیتے ہیں
چند ایسے بھی نکل آئیں گے خدّام یہاں

شکر ہے جوشؔ کہ اوراد و وظائف کے عوض
لب پہ ہے زمزمۂ حافظ و خیّام یہاں

ساقی

اُٹھ کہ خورشیدِ کہن ہے لبِ بام اے ساقی
جلد اُٹھا عصرِ جواں سال کا جام اے ساقی

جس کی سُرخی میں تھی آمیزشِ خونِ انساں
آج اس صُبح کی ہونے کو ہے شام اے ساقی

حوریانِ ارمِ کُہنہ کے اِس دُنیا میں
اَب اُکھڑتے نظر آتے ہیں خیّام اے ساقی

ہوگا اِک تازہ شریعت کا زمانے میں نفاذ
اب رہے گا یہ حلال اور نہ حرام اے ساقی

قصرِ اجسام سے اجرامِ فلک کی جانب
چند ہی روز میں جائیں گے پیام اے ساقی

یہ ہلال آج جو دُھندلا سا نظر آتا ہے
اس کو ہونا ہے ابھی ماہِ تمام اے ساقی

چند جرعے

جرعۂ اوّل

تعالی اللہ شانِ بادہ خواری
نئی ہلچل، نرالی بے قراری

کوئی کروٹ سی دل ہیں لے رہا ہے
لہو میں کشتیاں سی کھے رہا ہے

یہ کس کی سن رہی ہے رُوح آہٹ
رگوں ہیں ہے مزے کی سنسناہٹ

چمکتی ہیں فضا میں بجلیاں سی
لچکتی ہے رگ و پے میں کماں سی

زہے رفتارِ خونِ زندگانی
بغیر اسبابِ شادی، شادمانی

نئی شکلیں ہیں سینے پر منقّش
مبارک امتزاجِ آب و آتش

پئے بیٹھا ہوں آج اے زاہدِ خام
شرابِ رند خوار و ساغر آشام

اِدھر ہنگامۂ صہبا پرستی
اُدھر آویزشِ تمکین و مستی

سخن کی داد خود سے پا رہا ہوں
کلی کی طرح کھلتا جا رہا ہوں

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہد ریائی

جُرعۂ دوم

رگ و پے میں ہے غلطاں نوجوانی
ہر اک لمحہ ہے عُمرِ جاودانی

مری مٹھی میں ہے روحِ مہ و سال
تپاں ہے ماضی و مستقبل و حال

ترانے، وقت سے آزاد ہو کر
ہوئے ہیں ساز کے پردوں سے باہر

گھٹا سی اک سُنہری آ رہی ہے
پھُریری پر پھُریری آ رہی ہے

گراں زنجیرِ دانش، گل رہی ہے
متانت کی جوانی ڈھل رہی ہے

ہواؤں میں ہیں شاہانہ ترانے
اُبلتے ہیں گلابی سے خزانے

سُبو کی آگ سے دہکے ہُوئے ہیں
فضا میں پھُول سے مہکے ہُوئے ہیں

چمن بر دوش ہے کوئل کی کُو کُو
صُراحی در بغل پھُولوں کی خوشبو

کبھی ظلمت، کبھی انوارِ مہتاب
خُدا معلوم، بیداری ہے یا خواب

یہ کیسی طرفگی ہے آج ساقی؟
صُراحی میں ہے نورِ وجہ باقی

اُٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زُہدِ ریائی

جُرعۂ سوم

تعالیٰ اللہ شانِ مے پرستی
گھٹا سی ہے گرجتی اور برستی

ندی ساون کی چڑھتی آرہی ہے
سوئے میخانہ بڑھتی آرہی ہے

اُٹھی ہیں جھومتی کالی گھٹائیں
گھٹائیں، شوخ، متوالی گھٹائیں

اُبلتی ہے شرابِ ارغوانی
برستا ہے مزے لے لے کے پانی

سرِ میخانہ حوریں آرہی ہیں
نگاہیں، رام رس ٹپکا رہی ہیں

ہر اک ذرّے میں جنباں ہیں زبانیں
زمیں پر لوٹتی پھرتی ہیں تانیں

فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں!
بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں

ہر اک ذرّہ کِھلا جاتا ہے گویا
گلے آ کر، ملا جاتا ہے گویا

بڑھا جاتا ہوں، دریا ہو کہ وادی
مبارک دولتِ خود اعتمادی

ہوائیں چل رہی ہیں سنسناتی
مہکتی، سرسراتی، گنگناتی

شریعت پر تباہی آرہی ہے
مشیّت کو جماہی آرہی ہے

اُٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جرعۂ چہارم

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری
ستاروں پر ہے میرا حکم جاری

زمیں اس وقت اِک وہم وگماں ہے
مرے شہپر کے نیچے آسماں ہے

اَبد کا نوُر رقصاں ہے جبیں پر
خلا ہے وقت کے سینے کے اندر

ہر اک لمحہ، ترانے گا رہا ہے
زمانہ یوں کمر لچکا رہا ہے

برستے ہیں فسوں پرور ترانے
اُبلتے ہیں جوانی کے فسانے

مجازی صورتوں پر ہے بحالی
حقایق ہو چکے ہیں لااُبالی

بہکتے، رقص کرتے، لڑکھڑاتے
اُٹھے ہیں مُغبچے دھومیں مچاتے

چمکتی ہیں بتوں کی بالیاں سی
فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی

جوانی رُوح میں اٹھلا رہی ہے
نظر پر کاکلیں بکھرا رہی ہے

نہ دل کو امتیازِ این وآں ہے
نہ خود پر بندہ ہونے کا گماں ہے

اُٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زُھدِ ریائی

جُرعۂ پنجم

تعالی اللہ شکستِ خُود نمائی
بھرا ہے خاک میں زورِ خُدائی

فلک پر نشہ سا چھایا ہُوا ہے
زمیں کو حال سا آیا ہُوا ہے

جوانی ہے زمیں سے آسماں تک
برابر آسماں سے لامکاں تک

چمن میں فصلِ گل اٹھلا رہی ہے
ہوَا پہ عمرِ رفتہ گا رہی ہے

ہتھیلی پہ لئے ہوں گُلستاں کو
کہاں کا گلستاں، سارے جہاں کو

فلک حیرت سے مُنہ کھولے ہُوئے ہے
زمیں اُڑنے کو پر تولے ہُوئے ہے

فرشتے ہر طرف منڈلا رہے ہیں
پیامی آ رہے ہیں، جا رہے ہیں

نظر میں صُورتیں سی پھر رہی ہیں
نقابیں اُٹھ رہی ہیں، گر رہی ہیں

شریعت سے کنارا ہو چکا ہے
مشیّت کا اشارا ہو چکا ہے

جبینِ "حال" پر ہے نقشِ "ماضی"
کوئی حد بھی ہے ان بدمستیوں کی

زمانے کے بعید و متصّل، مست
دماغِ عقل پرور مست، دل مست

بقا مست و حیاتِ جاوداں مست
فنا سرشار و مرگِ ناگہاں مست

ہوائے تاک و برگِ یاسمن مست
بُتِ نوخیز و صہبائے کُہن مست

بلند و پست مست و جزو و کل مست
عنادل مست، گل چیں مست، گل مست

شگوفہ مست و مُل مست و چمن مست
زباں مست و دہاں مست و سخن مست

تدبّر مست، حکمت مست، دیں مست
عقائد مست، ظن مست و الیقیں مست

ملک مست و فلک مست و قضا مست
قمر مست و فضا مست و صبا مست

مغنّی مست، بربط مست، لے مست
سُبو کش مست، ساغر مست، مے مست

خزف مست و صدف مست و گہر مست
شرر مست و حجر مست و شجر مست

جہاں مست و زماں مست و مکاں مست
عناصر مست، جوہر مست، جاں مست

رواجِ خیر مست و رسمِ شر مست
سفالیں کُوزہ مست و کوزہ گر مست

یہ ہے بد مستیوں کا زور، ساقی
محیطِ غیب میں ہے شور، ساقی

مجھے ارض و سما سے کد نہیں ہے
وگرنہ مستیوں کی حد نہیں ہے

اگر چاہوں تو دُنیا کو ہلا دوں
زمیں کیا، آسمانوں کو نچا دُوں

فلک کیا، عرش کو بھی پست کر دُوں
خودی کیسی، خُدا کو مست کر دُوں

جہاں مَیں تھا

شبِ آغوشِ چمن میں صبحِ خنداں تھی جہاں میں تھا
ہوائے سرد، موجِ آبِ حیواں تھی جہاں میں تھا

زمیں کے چہرۂ رنگین سے ایسی لَو نکلتی ہے
فلک کی شمع رہنِ طاقِ نسیاں تھی جہاں میں تھا

چمن کے صحنِ رنگیں پر حقائق یُوں برستے تھے
لبِ ہر برگ پر تفسیرِ قرآں تھی جہاں میں تھا

سحر تک شمعِ کافوری کے غم رفتار اشکوں میں
تبسّم ریزِ روحِ شبنمستاں تھی جہاں میں تھا

فرازِ ذہن کے رُومان پرور ابر پاروں میں
نظر افروز برقِ روئے تاباں تھی جہاں میں تھا

شعاعِ عارضِ افسانۂ روئے مجازی سے
حقیقت مضطر و سر در گریباں تھی جہاں میں تھا

صنم بر دوش و کُفر انگیز محرابِ کلیسا میں
حرم کی شمعِ ایمانی فروزاں تھی جہاں میں تھا

حقائق کے معطر جامعِ اضداد بستر پر
بہم خوابیدہ روحِ کُفر و ایماں تھی جہاں میں تھا

سرشتِ آدم و ابلیس تھی یُوں محوِ سرگوشی
خجل آویزشِ یزداں و شیطاں تھی جہاں میں تھا

چمن کے سرو آوارہ خس و خاشاک کے اندر
جہندہ نبضِ رعد و برق و باراں تھی جہاں میں تھا

ز راہِ معدلت کوشی زبانِ مریمِ عصمت
جنونِ ذوقِ عصیاں کی ثنا خواں تھی جہاں میں تھا

ستارے نقش بر دیوار تھے، مہتاب سکتے میں
مشیّت گوش بر آوازِ رنداں تھی جہاں میں تھا

سرشکِ گریۂ پنہاں کی ظلمت خیز تابش میں
نگارِ خندۂ عشرت غزل خواں تھی جہاں میں تھا

عروسِ وقت کی خواب آفریں آسودہ گامی سے
سبک رفتار نبضِ چرخِ گرداں تھی جہاں میں تھا

کبھی چہرے دمکتے تھے کبھی زُلفیں بکھرتی تھیں
حقیقت نیم پیدا نیم پنہاں تھی جہاں میں تھا

کسی چشمِ سیہ کے بزم آرا مست پرتو سے
ہر اک ذرّہ میں اک رُوحِ شبستاں تھی جہاں میں تھا

دہکتے مُسکراتے نیم وا غنچوں کے جھرمٹ میں
جوانی کی شکر خوابی پر افشاں تھی جہاں میں تھا

وفورِ آرزوئے جنبشِ دستِ زُلیخا میں
عروسِ یوسفیت چاک داماں تھی جہاں میں تھا

قریبِ آبِ جوئے میداں کے دُھندلے کناروں پر
محبّت کا کلیں کھولے خراماں تھی جہاں میں تھا

ملائک ہی نہ تھے سجدے میں پیشِ آدمِ خاکی
الوہیت بھی زیرِ دامِ انساں تھی، جہاں میں تھا

نمازِ صبوحی

وفا شعار ہوں، ترکِ وفا نہیں کرتا
کبھی نمازِ صبوحی قضا نہیں کرتا

سوائے بادۂ دیرینہ و بُتِ نوخیز
خُدا سے اور کوئی میں دُعا نہیں کرتا

جو نامُراد کہ کرتا نہیں گُناہ کوئی
وہ حقِّ حضرتِ آدمؑ ادا نہیں کرتا

جزائے خیر کا اِس بیخودی پہ طالب ہوں
کہ مَیں تصوّرِ یومِ جزا نہیں کرتا

ہزار بار کیا عہد، ترکِ صہبا کا
مگر تبسّمِ ساقی خطا نہیں کرتا

کب آئیگا؟

بالینِ غم پہ عیسیٰ دوراں کب آئے گا
معبودؔ وہ پیمبرِ درماں کب آئیگا

دل تنگ ہوں حیات کے اس دورِ فتنہ سے
یارب مرا وہ فتنۂ دوراں کب آئیگا

جس پر ہزار بار فدا جانِ میزباں
اے گردشِ زمانہ وہ مہماں کب آئیگا

چھانے لگی ہے زیست پہ تاریکیٔ اجل
آخر پیامِ چشمۂ حیواں کب آئیگا

بول اے دیارِ شوق کی پُرہول خامشی
وہ مستِ ناز و یارِ غزلخواں کب آئیگا

تکلیفِ ہوش آتشِ دوزخ سے کم نہیں
وہ خُم بدوش و میکدہ ساماں کب آئیگا

مُدت ہوئی کہ سلطنتِ جاں ہے بے خروش
وہ شہریارِ سلطنتِ جاں کب آئے گا

جنّ و بشر بتاؤ، زمین و زماں بتاؤ
اپنے گدا کے پاس وہ سُلطاں کب آئیگا

جس کے ہر اک نفس پہ چمن کے چمن نثار
یارب ادھر وہ زندہ گلستاں کب آئیگا

میرے دیارِ دوش کی جانب بشکلِ موج
وہ کاروانِ زُلفِ پریشاں کب آئیگا

ظُلمت نصیب شام کے ایوانِ تیرہ میں
یارو صفیرِ صُبحِ زرافشاں کب آئیگا

اِس اشکبار دیدۂ محرُوم کے قریب
آنسُو جو پُوچھتا تھا وہ داماں کب آئیگا

تاریکیوں میں نُور کا نِکلے گا کب جلوس
پہلوئے شب میں ماہِ درخشاں کب آئیگا

کم ہو چلی ہیں نبضِ تمنّا کی گرمیاں
اِس جُوئے سُست موج میں طُوفاں کب آئیگا

نازاں بہت ہیں دین پہ یارانِ پارسا
اِس شہر میں وہ دُشمنِ ایماں کب آئیگا

نیازِ ناز

لو آگئیں وہ دعوتِ ایماں لئے ہوئے
شانوں پہ کفرِ زُلفِ پریشاں لئے ہوئے

رفتار، شاخِ گُل کا مٹاتی ہوئی غرور
گفتار، نغمہ ہائے بہاراں لئے ہوئے

آنکھیں، فروغِ جلوۂ رنگیں سے گلفروش
بانہیں، جمالِ خنجرِ عُریاں لئے ہوئے

تارِ نظر میں روشنیٔ صُبحِ زندگی
موجِ نفس میں چشمۂ حیواں لئے ہوئے

بکھرائے مُصحفِ رُخِ رنگیں پہ کاکلیں
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قُرآں لئے ہوئے

ہر اک قدم پہ گوئے دو عالم سے کھیلتی
گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لئے ہوئے

بادِ شمال و ابرِ خراماں و موجِ گُل
ہر آب و رنگِ عالمِ امکاں لئے ہوئے

رُک جائے جسکو دیکھ کے طُغیانیوں کی سانس
آنکھوں میں وہ شباب کا طوفاں لئے ہوئے

دستِ حنا نواز میں باوصفِ نازکی
عشقِ زمانہ سوز کا داماں لئے ہوئے

رُخسار میں جلائے ہوئے شمعِ اختلاط
آنکھوں میں التفاتِ فراواں لئے ہوئے

شیریں لبوں میں حرف و حکایت کے ولولے
چشمِ سیہ میں دید کا ارماں لئے ہوئے

چہرے پہ صبحِ عشق و جوانی کی سُرخیاں
آنکھوں میں شامِ خوابِ پریشاں لئے ہوئے

جادُو بھری نگاہ میں اک داستانِ غم
غم کی جلو میں شکوۂ دوراں لئے ہوئے

آنکھوں میں عزمِ جامہ دری، دل میں خوفِ خلق
پلکوں میں پارہ پارہ گریباں لئے ہوئے

ژولیدگیٔ کاکُلِ عنبر سرشت میں
شرحِ درازیٔ شبِ ہجراں لئے ہوئے

لہجے میں، چوٹ کھائے ہُوئے دِل کی کروٹیں
آواز میں، خراشِ رگِ جاں لئے ہوئے

خُود دوش پر اُٹھائے ہُوئے کائناتِ درد
ہر دردِ کائنات کا درماں لئے ہوئے

نازِ جمالِ یار ہے حرفِ غمِ نیاز
اُٹھ جوشؔ اُٹھ، متاعِ دل و جاں لئے ہوئے

ہنوز

سُن کہ آئینۂ آغاز ہے انجام ہنوز
دِل میں نشتر سا کھٹکتا ہے ترا نام ہنوز

تیری جانب سے نہ نامہ ہے نہ مُدت سے پیام
اور یہاں ہے خلشِ نامۂ و پیغام ہنوز

ہو چکی ہے ترے گھر صُبحِ سعادت طالع
اور مرے خانۂ تاریک میں ہے شام ہنوز

تُجھ میں اب ولولۂ عیش و طرب ہے بیدار
اور یہاں غم پہ مُصر ہے دلِ ناکام ہنوز

تیرے خلوت کدۂ ناز میں ہے چنگ و رباب
اور یہاں بزمِ تمنّا میں ہے کہرام ہنوز

حسبِ اوقات مُقرّر ہے ترا رامش و رنگ
اور یہاں ایک ہے رنگِ سحر و شام ہنوز

پُختہ کاری میں گرفتار ہے اب عقل تری
اور یہاں دل ہے اسیرِ ہوسِ خام ہنوز

رنگ چہرے کا اُڑاتا ہے ترا ذکر اب تک
نیند آنکھوں سے چُراتا ہے ترا نام ہنوز

اب تری ہی شمع ہے اور خلوتِ محرابِ حرم
یاں چراغاں ہے سرِ رہگذرِ عام ہنوز

تجھ کو اک عمر ہوئی بندِ وفا سے چھوٹے
جانِ محزوں ہے یہاں مُرغِ تہِ دام ہنوز

پھر سے کھوئی ہوئی توقیر کے پانے والے
دیکھ تحقیر کے شایاں ہے مرا نام ہنوز

اب ترے سر پہ نہیں ابرِ ملامت کی گرج
اور میں ہوں ہدفِ ناوکِ دُشنام ہنوز

خارج از بحث ہے اب تیرا گناہِ اُلفت
اور محبّت کا مرے دل پہ ہے الزام ہنوز

ہو چکی ہے تری ناکردہ گناہی ثابت
اور مرے جرم کا ہے غُلغلۂ عام ہنوز

داد دے اے مرے نو واردِ شہرِ ناموس
جوشؔ ہے کوچہ و بازار میں بدنام ہنوز

نقشِ خیال دِل سے مِٹایا نہیں ہنوز

نقشِ خیال دل سے مٹایا نہیں ہنوز
بیدرد میں نے تجکو بھلایا نہیں ہنوز

تیری ہی زُلفِ ناز کا اب تک اسیر ہوں
یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

یادش بخیر جس پہ کبھی تھی تری نظر
وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز

وہ سر جو تیری راہ گزر میں تھا سجدہ ریز
مَیں نے کسی قدم پہ جھکایا نہیں ہنوز

محرابِ جاں میں تُو نے جلایا تھا خود جسے
سینے کا وہ چراغ بُجھایا نہیں ہنوز

اُس پیکِ خاص کو جسے ٹھکرا چکا ہے تُو
اپنی نظر سے مَیں نے گرایا نہیں ہنوز

بیہوش ہو کے جلد تجھے ہوش آگیا
مَیں بدنصیب ہوش میں آیا نہیں ہنوز

دُنیا نے تجکو خوابِ گراں سے جگا دیا
لیکن مجھے کسی نے جگایا نہیں ہنوز

تو کاروبارِ شوق میں تنہا نہیں رہا
میرا کسی نے ہات بٹایا نہیں ہنور

گردن کو آج بھی تری بانہوں کی یاد ہے
یہ منتوں کا طوق بڑھایا نہیں ہنوز

مر کر بھی آئے گی یہ صدا قبرِ جوشؔ سے
بیدرد مَیں نے تجکو بھلایا نہیں ہنوز

ہنوز یاد ہے

ہنوز یاد ہے وہ رنگِ اضطراب ترا
بھرا تھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا

عجیب دَور تھا وہ دَور بھی جب او ظالم
لباسِ عشق میں تھا حُسنِ لاجواب ترا

جو شب کو رُوپ میں پروانے کے تھی شمع تری
سحر کو بھیس میں بُلبُل کے تھا گلاب ترا

وہ تیری پہلی مُلاقات کی رُو پہلی رات
اُدھر تھا چاند، اِدھر دیدۂ "پُر آب" ترا

کبھی خُدا کی مشیّت پہ برہمی تیری
کبھی خُود اپنی تمنّاؤں پر عتاب ترا

وہ ماہتاب کے طُوفاں میں اُلجھنیں تیری
وہ ابر و باد کی ہلچل میں اضطراب ترا

وہ ابتدائے محبّت کی تُند راتوں میں
بساطِ غم پہ مچلتا ہُوا شباب ترا

وہ آنسوؤں کے دُھندلکے میں چشمِ ناز تری
وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرشِ خواب ترا

وہ بات بات میں چھالے کا سا تپک اُٹھنا — نظر جُھکا کے وہ لہجہ دمِ خطاب ترا
وہ میری بزمِ محبّت، وہ تیری شمعِ جمال — وہ دامِ ذرّۂ خاکی میں آفتاب ترا
وہ تیری زُلف کے خم سے مری پریشانی — وہ اپنی سانس کی خُوشبو سے پیچ و تاب ترا
وہ اضطراب کا رَوندا ہوا سکون مرا — وہ وَلولوں کا ستایا ہُوا حجاب ترا
مژہ کی طرح جھپکتا ہُوا وہ میرا سوال — وہ دل کی طرح دھڑکتا ہُوا جواب ترا

نہ پُوچھ جوشؔ سے کس درجہ تلخ و شیریں ہے
اُس التفات کے بعد اب یہ اجتناب ترا

تیرا عہدِ تمنّا

۱۹۲۷ء

دِل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھکو
یاد ہے وہ خلشِ عہدِ تمنّا تجھکو

چونکتے ہی ترے دل سے وہ دھواں اُٹھتا تھا
شبِ تاریک تھا ہر نور کا تڑکا تجھکو

نرگسِ ناز میں یوں اشک بھرے رہتے تھے
نظر آتا تھا ورقِ دہر کا دھندلا تجھکو

الاماں عشق میں اُلجھی ہوئی نیچی نظریں
دل سا ملتا تھا ہر اک شے میں دھڑکتا تجھکو

روزِ باراں میں ستاتا تھا غمِ عشق تجھے
شبِ مہتاب میں ڈستی تھی تمنّا تجھکو

ہر گھڑی میری حضوری کی تمنّا تھی تجھے
ہر نفس میری جدائی کا تھا دھڑکا تجھکو

ہائے کیا دن تھے کہ آئینے کے آگے ہر صبح
چاند سا منہ نظر آتا تھا جب اُترا تجھکو

حضرتِ خضر جہاں راہ بھٹک جاتے ہیں
عشق نے لاکے وہاں چھوڑ دیا تھا تجھکو

جب ہوا ابر کے سائے میں سنک جاتی تھی — چھیڑ دیتا تھا محبت کا تقاضا تجکو
چاندنی صحن میں جسوقت چھٹک جاتی تھی — پھونک دیتا تھا مرے عشق کا شعلا تجکو
راستے سے کوئی آواز جب آ جاتی تھی — میری آواز کا ہو جاتا تھا دھوکا تجکو
قہر ڈھاتا تھا مرا درسِ تحمّل تجھ پر — زہر لگتا تھا مرا وعدۂ فردا تجکو
کیا قیامت تھی کہ اس گل بدنی کے باوصف — روز کانٹوں پہ لُٹاتی تھی تمنّا تجکو
میں کبھی بات پہ دم بھر کے لئے غور کروں — اِتنی فرقت بھی نہ ہوتی تھی گوارا تجکو

جوشؔ سے پُوچھ کہ اب تک ہے اُسے یاد وہ دور
کہ کبھی مہر و وفا کا بھی تھا دعوے تجکو

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سُلطاں آیا

اے کلی! ناز سے کھل، بادۂ سرجوش اُبل
کہ نگارِ چمن و شاہدِ مستاں آیا

دُور اے زہد! کہ وہ زہد شکن آپہنچا
رخصت، ایماں! کہ وہ غارتگرِ ایماں آیا

خاطرِ جمع سے ہُشیار، کہ برہم ہوئی زلف
کشتیِ دل سے خبردار کہ طوفاں آیا

بوستاں! وجد میں آ، عشق! غزلخواں ہو جا
کہ گلِ سرسبد و سروِ خراماں آیا

اے چمن! عید منا، ابر ہوا گرمِ خرام
اے صبا! ناز سے چل، موسمِ باراں آیا

مژدہ اے کارگہِ بستہ، کہ ہمراہِ نسیم
پیکِ مشکیں نفسِ کاکلِ پیچاں آیا

شاد باش اے سحرِ عید، کہ بالیں پہ مری
بار با سلسلۂ زلفِ پریشاں آیا

کج کلاہی کا سر و برگ مبارک اے جوشؔ
لے پیامِ شکنِ طرۂ جاناں آیا

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا
رِندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا

اے حُسن! داد دے کہ تمنّائے عشق نے
تیری حیا کو عشوۂ تُرکانہ کر دیا

قرباں ترے کہ اک نگہِ التفات نے
دل کی جھجھک کو جرأتِ رِندانہ کر دیا

صد شکر درسِ حکمتِ ناحق شناس کو
ہم نے رہینِ نعرۂ مستانہ کر دیا

کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی
آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کر دیا

دُنیا نے ہر فسانہ "حقیقت" بنا دیا
ہم نے حقیقتوں کو بھی "افسانہ" کر دیا

آواز دو کہ جنسِ دو عالم کو جوشؔ نے
قربانِ یک تبسُّمِ جانانہ کر دیا

نہ جانے رات کو کیا میکدے میں مشغلہ تھا — کہ ہر نفس میں قیامت کا جوش و ولولہ تھا
نگاہِ یار کی یوں اُٹھ رہی تھی جھک جھک کر — زمین رقص میں تھی آسماں پہ زلزلہ تھا
لرز رہے تھے شگوفے، تڑپ رہے تھے نجوم — چھڑا ہوا نہیں معلوم کون مسئلہ تھا
کبھی ہلال چمکتا تھا، اور کبھی خنجر — میانِ عشق و جوانی عجیب مرحلہ تھا
تپاں تھا دائرۂ خاک و عالمِ ارواح — نیاز و ناز میں کیا جانے کیا معاملہ تھا
زباں پر آئیں تو ہر حرف سے لہو ٹپکے — ہر ایک سانس میں ان ولولوں کا قافلہ تھا
دل و نگاہ میں تھی کچھ لطیف گفت و شنود — نہ جانے شکرِ کرم تھا کہ شکوہ و گلہ تھا
اُدھر تھی لرزشِ صہبا، اِدھر خرامِ نگاہ — نرالی بحث چھڑی تھی، نیا مقابلہ تھا
بساطِ خاک سے تا اوجِ ثابت و سیارہ — شمیمِ کاکلِ عنبر فشاں کا سلسلہ تھا
ترانہ ریز تھی نبضِ حیات کی جُنبش — ضمیرِ شب میں وہ پنہاں خروش و ولولہ تھا

ہزار شکر ذرا بھی کمی نہ کی اے جوشؔ
اگرچہ دیکھنے میں یار تنگ حوصلہ تھا

اُٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گہرپاشیاں کر، زرافشانیاں کر

وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر

صُراحی جُھکا، اور دُھومیں مچادے
گلابی اُٹھا، اور گل افشانیاں کر

مٹا داغِ ہوش اور مدہوش بن جا
اُٹھا جامِ زر، اور سُلطانیاں کر

نگاہوں سے برسادے ابرِ جوانی
مئے لالہ گوں سے گلستانیاں کر

سمندر پہ چل، اور الیاس بن جا
ہواؤں پہ اُڑ، اور سلیمانیاں کر

صبا کی طرح کنج میں رقص فرما
بگولوں کے مانند جولانیاں کر

سکوں پاؤں چُومے وہ ہلچل مچادے
خرد سر جُھکادے وہ نادانیاں کر

عَلم کھول کر جوشِ بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر

اُٹھ، کہ تعمیرِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
جز مئے ناب، سر و برگِ جہاں کچھ بھی نہیں

آ، کہ یہ وسوسۂ ارض و سما ہے بیکار
اُٹھ، کہ یہ واہمۂ سود و زیاں کچھ بھی نہیں

وہ سہی قد، لبِ ساحل جو نہ ہو گرمِ خرام
قامتِ سرو و خمِ آبِ رواں کچھ بھی نہیں

جام اُٹھا جام، کہ سرشاری و مستی کے بغیر
خندۂ حور و تماشائے جناں کچھ بھی نہیں

پرتوِ چشمِ فسوں خیزِ برہمن کے سوا
نقشِ رنگینیٔ رخسارِ بتاں کچھ بھی نہیں

فیض اُٹھا حسنِ جوانانِ چمن سے کہ ندیم
عالمِ پیر بجز وہم و گماں کچھ بھی نہیں

اُس کے نزدیک سمجھتا ہو جو اسرارِ بہار
خوفِ گلچین و غمِ بادِ خزاں کچھ بھی نہیں

جز غمِ عشق، غمِ کون و مکاں بے بُنیاد
جز دلِ شاد، متاعِ دو جہاں کچھ بھی نہیں

ایک ذرّہ بھی ہو محسوس تو سب کچھ ہے وہی
ہو نہ محسوس تو خلّاقِ جہاں کچھ بھی نہیں

مرضِ زیست کا اے جوشؔ زمانے میں علاج
جز مئے کہنہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو؟ خاک ہونا ہے تو خاکِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو؟

دہر میں اے خواجہ ٹھہری جب اسیری ناگزیر دل اسیرِ حلقۂ گیسوئے پیچاں کیوں نہ ہو؟

زیست ہے جب مستقل آوارہ گردی ہی کا نام عقل والو! پھر طوافِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو؟

مستیوں سے جب نہیں مستوریوں میں بھی نجات دل کھلے بندوں غریقِ بحرِ عصیاں کیوں نہ ہو؟

اک نہ اک ہنگامے پر موقوف ہے جب زندگی میکدے میں رند رقصاں و غزل خواں کیوں نہ ہو؟

جب خوشی و ناخوشی کسی کے ہاتھ میں دینا ہے ہاتھ ہمنشیں! پھر بیعتِ جامِ زرافشاں کیوں نہ ہو؟

جب بشر کی دسترس سے دور ہے حبل المتیں دستِ وحشت میں پھر اک کافر کا داماں کیوں نہ ہو؟

ایک ہے جب شورِ جہل و بانگِ حکمت کا مآل دل ہلاکِ ذوقِ گلبانگِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

اک نہ اک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر آدمی محوِ سجودِ سرو خوباں کیوں نہ ہو؟

اک نہ اک پھندے ہی میں پھنسنا ہے جب انسان کو دوش پر دامِ سیاہِ سنبلستاں کیوں نہ ہو؟

جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد لذتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو؟

یاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذروں کو چھوڑ کر آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو؟

اک نہ اک ظلمت سے جب وابستہ رہنا ہے تو جوشؔ
زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

ٹھنڈی ہوا ہے رقص میں ہے ابرِ بہمنی
ہاں دیر کیا ہے؟ ساقیٔ رنگیں! ہوالغنی

اِنساں، اور ہو نہ سکے خوش! اُٹھا تو جام
نادان! تیرے دل کی کلی ہے شگفتنی

ہاں چھیڑ بھی رباب کہ ہے گرمِ اختلاط
حسنِ مہِ دو ہفتہ و ابریقِ یک منی

اِس خاکداں میں جُز رُخِ محبوب و سازِ کیف
اِک چیز دیدنی ہے، نہ اِک شے شنیدنی

آ مست ہو کے ناز کو دے دعوتِ نیاز
نبضِ صنم میں گرم ہے خونِ برہمنی

اُٹھ، گوشِ دل کو قلقلِ مینا سے تیز کر
تا سُن سکے صبا کے سخن ہائے گفتنی

صہبا سے دھو نگاہ، کہ غلطاں ہے دیر سے
جاناں کے دل میں آرزوئے بُرقعہ افگنی

چھلکا چمن میں جام کہ یہ رُو بھی دیکھ لے
سبزے پہ اوس، اوس پہ مے، مے پہ چاندنی

واللہ آج ہند میں تو جوشؔ فرد ہے
رحمت خُدا کی تجھ پہ ہو اے مردِ یک فنی

متاعِ حلقۂ ادراک و نقدِ عالمِ ہوش — فدائے ساقیٔ ساغر بدستؔ و زلف بدوش

زمانہ ذوقِ سماعت سے پی رہا ہے شراب — سُنا رہی ہے وہ افسانہ چشمِ بادہ فروش

یہ بزمِ نیم شبی ہے، یہ وقتِ رامش و رنگ — امامِ شہر! خبردار، محتسب! خاموش

مچل رہے ہیں تلاطم شراب خانے میں — مُغنّیانِ بہار و بُتانِ عشوہ فروش

کیے ہوئے ہے زمان و مکاں سے بیگانہ — شمیمِ گل کا تلاطم، صدائے نے کا خروش

کسی جبیں سے نمایاں نہیں وبائے خرد — کسی نگاہ میں باقی نہیں ملامتِ ہوش

اُبل رہی ہیں بہاریں، برس رہی ہے شراب — مچل رہی ہے کلیجوں میں بانگِ نوشا نوش

شرابِ کہنہ و مہتاب و ساقیٔ نوخیز — چمن میں آج یہ سب نعمتیں ہیں دوش بدوش

رگوں میں بادہ ہے، پہلو میں یار، سر پہ قمر — زمیں کنیز ہے آج، آسمان حلقہ بگوش

نہ کیوں ہو مطربۂ چرخ گوش بر آواز
اِس آرزو میں کہ سُن لے کلامِ حضرتِ جوشؔ

رُباعیات

(بنامِ خیّام)

خمریات

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کہ اے رندِ خراباتیٔ و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کُنیم پیمانہ زمے
زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

(خیّام)

جانے والے تم کو روکے گی کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے گی کوئی
تھک کے سر زانو پہ وہ سوئے ہیں ابھی
روکے روکے سحر کو روکے گی کوئی

اے حسن ٹھہر آ کہ کب جاگے گی
صہبا تری ساغر سے چھلک جائے گی
مجھ کو تو یہ ڈر ہے کہ دلالی کیسی
انگڑائی جو لی جلد مسک جائے گی

کل رات گئے مست تھی جب موجِ نسیم
شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم
اک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا
میں روح ہوں شیشے کی پیمانوں کی تسنیم

انجامِ طرب کا دھیان کرتے کیوں ہو؟
پیمانۂ دل اگر غم سے چھلکتے کیوں ہو؟
تا چند یہ تشویشِ مآلِ ہستی؟
اک روز مرو گے روز مرتے کیوں ہو؟

ساقی کا ہو رنگ الگ لطف سا کرلوں
ہر شے مرتب بھی ہر اک اشارا کرلوں
آدم کا میں ناطقہ نفسی فرزند ای جوش
عصیاں سے اگر بھی نہ سر اک کرلوں

ای سہو کے حاملو! خطا کے بندو!
ای حرص کے حامیو! ہوا کے بندو!
ناچیز نے ہے یہ بول لیکن عقل؟
ڈالے کبھی ہیں تو خدا کے بندو!

اور دل کو بتاؤں کہ سب باتیں الگ کھاتی ہیں
خود کو بھی پاس سناتا نہیں باتیں آتی
بر سا عشق خوش ہے بال مسرت وقت
قدرت سے چھپا رہا ہوں باتیں آتی

دے بادہ کہ ہو عقل معطل ساقی
اک شے بھی نہیں بیان مکمل ساقی
تفصیل کی مملکت میں دل تنگ ہوا ہیں
اجمال کی سلطنت میں لے چل ساقی

افسوس ہے اے عقل سے خالی دنیا
وابستۂ ننگ بے کمالی دنیا
کیا تو بھی ہے مستانہ خرامی کے خلاف؟
اے پیٹ کے بل رینگنے والی دنیا

سجدے کا فلک کو حکم دیتا ہوں میں
بحرِ حق میں سفینہ کھینچتا ہوں میں
جس وقت سبو ہات میں آجاتا ہے
نبضِ سرزمین دیکھ لیتا ہوں میں

بیلوں پہ چمک رہی ہیں بوندیں ساقی
خوشوں سے ٹپک رہی ہیں بوندیں ساقی
دے جام کہ برگہائے سبز و تر پہ
اورے کھنک رہی ہیں بوندیں ساقی

کل موتیوں کو رول دیا ساقی نے
سونے میں بھی تول دیا ساقی نے
پینے سے کہ کھلتا نہیں مقصودِ حیات
میخانے کا در کھول دیا ساقی نے

دنیا نہیں ہیچ، زندگانی ایسی
اللہ رے اور پریشانی ایسی
یہ شاہد و بادہ جس کی راتیں گذریں
دی ہیں مشیت نے جوانی ایسی

یہ ساعت عیش ہے نہ اب صبح خوش اوقات
ایسے میں ذرا سمجھ کے کہنا کوئی بات
لوح و قلم و کرسی و عرش و افلاک
اس وقت کھڑے ہوئے ہیں باندھے ہوئے ہات

چھپی تھی ایک بات میرے دل میں
پیوستہ ہوئی حیات میرے دل میں
ساقی نے سبو دے کے اٹھایا جو رباب
گم ہو گئی کائنات میرے دل میں

یہ لذت مے صہبا یہ ضیا باری ماہ
یہ زمزمہ یہ عود یہ چشم سیاہ
کل تک تو یہیں دنیا میں تھا اور اب دیکھ
خود میری ہستی بھی یہ ہے اللہ اللہ

وہ رات گئے شراب و وصلنا ہے ہے
چھلکے پہ صبا کا چلنا ہے ہے
وہ پچھلے پہر
معشوقہ کو نیند میں سے کا وہ رہ رہ کر
آنکھوں کو تیلیوں سے ملنا ہے ہے

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سر تا بقدم خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہر جبیں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

مستی لئے آنکھ ڈوروں سے چھائے ہیں
جس طرح گرہ دہان ہو افسانے ہیں
یا جیسے یکایک ہو نزول الہام
قریب صبح کے آیا کوئی میخانے میں

اسرار زبان کھول رہے ہیں پھر تو
اے شیخ کھرے تول رہے ہیں پھر تو
اے نغمہ گراں بار گناہ سے
جیسے لب ابر ابر بول رہے ہیں پھر تو

کیا شیخ نے لگا کے گل قشقا کرے ؟
کیا پاپ سے لگا کے دین جوانی کرے ؟
کیا پاپ سے گا ہوا ہے انہیں
قرآن شریف و رنج نے ڈرایا ہے
جو اگر گیا چاہئے ہیں پایا کرے

ہر آن جفا سے قلب دریا ہے
ہر بات پہ آسمان پہ چڑھ جاتا ہے
ہر بات پہ اس غنیمت ہیں شمار
کرتا ہے دل اس حال اگر جاتا ہے
لیکن وہ فراغت سے گزر جاتا ہے

معشوق کے رنج سے جا ملتی ہے جبیں
پیانے میں ہے ترا دوست سر دیں
پیانے میں ہے ترا روئے چہ بہشت
پیالے میں کھول دل سے چہ دنیا و چہ دیں
معشوق پہ وار دے چہ دنیا و چہ دیں

ہاں مشغلہ جام اسی جاری ہے
اب تک وہی کا ہمیں لا و جاری ہے
اب تک کے ہی کا ان سے الگ اسی
کہتا ہے کہیں ان سے
ہر دن کے ہاتھ سے لہو جاری ہے

خوشبوں سے مہک رہی ہے شبنم ساقی
فانوس ستاروں کے ہیں مدھم ساقی
ہاں جلد اٹھا جام کہ اب پیہم ساقی
اک آن میں بس ہے دم و ہمدم ساقی

غالب ہے مرا جذبۂ حیرت مجھ پر
اک قہر ہے ناکسوں کی صحبت مجھ پر
زاہد اگر آج سے کرے جائز
اک قطرہ بھی پیوں تو لعنت مجھ پر

ہشیار! کہ دل سے تاب و تب جاتی ہے
آغوش سے لیلائے طرب جاتی ہے
ساقی! غمِ صبح و بن فردا کے
دنیا ہے تو دے جام کہ شب جاتی ہے

بادل یہ وہ چھائی کہ جوانی ساقی
سنکی وہ ہوائے زندگانی ساقی
ہاں جلد اٹھا کہ جائے بنتی بگڑی
آیا وہ برستا ہوا پانی ساقی

کیا شرح کتاب زہد و عصیاں کر دوں؟
اضداد کی توضیح سے نمایاں کر دوں؟
کہتا ہے فقیہ شہر سے گو باطل
کیا حق ہے کہ شیخ کو عریاں کر دوں؟

پینے سے یہ برکت نہ رنگ پائے
ساقی! یہ طبیعت پھر نہ رنگ پائے
حلقے سے بنا رہی ہیں تسبیح یارب
اے دل سے والے الست نہ رنگ پائے

کرسی سے بلند ہے نشیمن اپنا
فردوس پہ خندہ زن ہے گلشن اپنا
کیوں کوثر و تسنیم کا جھگڑا کا نہ دو کریں؟
اچھا ہے کہ چھوڑ دوں میں یہ دامن اپنا؟

جب ہم کو نہ دیکھے وہ نظر سے ساقی
انگور سے دل لگے تو چھپ جب سے ساقی
قائل ہے کوئی چیز تو احساس لطیف
اس تیغ کی باڑھ کند کر دے ساقی

یہ ولولہ یہ شباب اللہ اللہ
یہ نہر یہ ماہتاب اللہ اللہ
کل تک تو فقط شراب کا بندہ تھا میں
اور آج ہوں خود شراب اللہ اللہ

ہے اوج ہی اوج پیش و پس اے ساقی
باقی نہیں اب کوئی ہوس اے ساقی
پیچھے ہے ہوا آسمان - ساغر توقف
وہ آگیا بابِ عرش بس اے ساقی

مسند پہ مری رباب رکھ دے ساقی
بھر کر قدحِ شراب رکھ دے ساقی
گل کر کے چراغِ علم و دانش للہ
اس طاق میں آفتاب رکھ دے ساقی

یہ کس کا تبسم ہے فضا میں ساقی؟
یہ کس کی جوانی ہے گھٹا میں ساقی؟
یہ کون بجا رہا ہے شیریں بربط
بھیگی ہوئی بارش کی ہوا میں ساقی؟

یہ زمزمہ یہ کیفِ عشق سیال
یہ وقت سے آزاد ابدیت کا جمال
مبہوت ہوئے دورِ فریبِ مہ و سال
معدوم ہوئے ماضی و مستقبل و حال

جاری ہے اس وقت سے لطیف گردشِ جام
مشہودہ ارواح سے پیغام و سلام
شق ہوئے طلسم ظلمات ابہام
روشن ہوئے وجہ ذوالجلال والاکرام

مقلوب یہ اصطلاحِ ایماں کر دے
فردوس کو زیبِ طاقِ نسیاں کر دے
ساقی ہے مغنی ہے چمن ہے نغمہ ہے
اس نقد پہ سو دو جہاں قرباں کر دے

ساقی! اب غمِ بیش و کم سے ڈرنا کیوں ہے؟
پیچ بلاؤں میں ہوں ڈرنا کیوں ہے؟
بے کون و مکاں سرکتے شانے پہ ردا
اور بیخودی میں مذاق ڈرنا کیوں ہے؟

گلشن کی روش پہ مسکراتا ہوا چل
بدمستیٔ گھٹا سے لڑکھڑاتا ہوا چل
کل خاک میں مل جائے گا یہ زورِ شباب
جیتیں آج تو بانکپن دکھاتا ہوا چل

ہر شمع کو شمع طور کر دے ساقی
آ ظلمتِ شب کو نور کر دے ساقی
ہر چیز کی دوا ہے دنیا میں بہار
سر بیں کو مجھ سے دور کر دے ساقی

منے تو یہ پھر جہاں ملے یا نہ ملے
مے کش یہ یہ گلستاں ملے یا نہ ملے
پینے میں کمی نہ چھوڑ او خانہ خراب
معلوم نہیں وہاں ملے یا نہ ملے

دلدادۂ عالم کو تجلی میں غرق کر دے ساقی
آ دہر میں اب سر کو بھی غرق کر دے ساقی
اس وسعتِ ارض و سما کو بلند
اٹھ فلک گراں میں غرق کر دے ساقی

ہر آن جگا رہی ہے قدموں کی صدا
گو ہم پہ چھپا رہی ہے قدموں کی صدا
دے جام کہ بڑھتی ہی چلی آتی ہے موت
جب سانس میں پا رہا ہوں قدموں کی صدا

حق کو بہ خوف و غم، ہر دل چاہتا ہے
باطل بہ طرب جانب، ہر نئی چاہتا ہے
لیکن یہ بزرگوار جو چپ بیٹھے ہیں
کیا قادر مطلق بھی وہی چاہتا ہے؟

کیا فائدہ، شیخ! اگر آپ سے کینے میں ہیں ہم
جنگل میں ہیں گر آپ، سفینے میں ہیں ہم
عیاش تو دونوں ہیں، اگر کم ظرف ہیں آپ
کھانے میں ہیں گر آپ، تو پینے میں ہیں ہم

پروردۂ شیون ہے یہ تکلّم میرا
فریاد کی آل ہے یہ ترنّم میرا
نالے کا اُسے کرن کہ ہوتا ہے طلوع
آنسو کے افق سے ہے یہ تبسّم میرا

حقائق

اپنے ہی لیے کسب ہنر کرتا ہوں میں
کہتا ہوں پیش اپنی نظر کرتا ہوں میں
بندے کو اگر ناز شاعری سے ننگ سہی
اللہ کو بھی مسرور کرتا ہوں میں

اپنے ہی دماغ و دل کا مقصود ہوں میں
خود اپنے ہی دل میں ایک اپنا مسجود ہوں میں
واقف نہیں ہوں کہ سوچتے ہیں سب جی کا زیاں
سب اپنے ہی سوچنے میں بیسود ہوں میں

اک گھر میں ہوئی ہے بصیرت پیدا
کرتا ہے خدا شاذ و یہ دولت پیدا
اگر اک گھر میں یکلخت اثر جائے اگر
ہو علم سے ہوئی ہے جہالت پیدا

یہ عمر دو روزہ کہ ہے مانند سراب
اک خندۂ غم ہے اک سکون بیتاب
یا سایہ ہے میان ہستی و عدم
یا وہم ہے کہ میان بیداری و خواب

کچھ شغل نہیں یہاں آہ بھرنے کے سوا
جی میں ہے کہ آگے گزرنے کے سوا
دیکھا تو کوئی چیز نہیں ہے پہلو
دنیا میں کسی چیز سے ڈرنے کے سوا

پہلو میں ہمارے دیدۂ پرنم ہے کہ دل
معبود ایک مقیاس تیغ غم ہے کہ دل
یہ ذرہ بھی کیا ہے جا بجا ہے
پیمانۂ ناسوت و دو عالم ہے کہ دل

زمین سے کچھ اور، حکم فطرت سے کچھ اور
قانون سے کچھ اور، آدمیت سے کچھ اور
اللہ کا قول و فعل اتنا متضاد
احکام سے کچھ اور ہیں، مشیت سے کچھ اور

بت ساز ہے تو پھر کے قابل مانا
لیکن اس کو مرے برابر نہ سمجھ
پتھر کو تراش کر بنایا ہے وہ بت
میں بت کو تراش کر بنایا ہوں خدا

اپنی ہی کرامت میں خود انسان ہے آج
کل صاحب جبر تھا، حیران ہے آج
جو وقت کے اقتضا سے تھی کل اک رسم
وہ وہم ہے ارتقائے ایمان ہے آج

ہر عالم دیں پیش نگاہ، جاہل نکلا
ہر کوہ، مثال برگ کاہ، بے بس نکلا
افسوس کہ گشتہ میوہ ہائے حق کا
چھلکا جو ہٹایا تو مغز باطل نکلا

پیش کر پروردگار اس کا کرتا شیطاں
دولت اپنی نثار کرتا شیطاں
انساں کی خباثت سے جو ہوتا آگاہ
اک سجدہ نہیں ہزار کرتا شیطاں

اک قاعدہ مرا ہوا ہے اور کچھ بھی نہیں
تخئیل کا سلسلہ ہے اور کچھ بھی نہیں
کہتا ہے جسے فرشتہ انساں لیکن
اک وہم کا ارتقا ہے اور کچھ بھی نہیں

دریائے عمل میں حبابوں کو نہ دیکھ
اوراقِ چمن الٹ کتابوں کو نہ دیکھ
بیٹھے ہوئے اک ذرۂ خاک کے حضور
ڈوبے ہوئے لاکھ آفتابوں کو نہ دیکھ

ہر سانس میں سو بلائیں سہنے والے
امواجِ نفس کی رو میں بہنے والے
اللہ تری شمع کو روشن رکھے
اے گنبدِ بادیہ میں رہنے والے

صدموں میں بجائے نالہ ہائے خوں بار
جیسے ہی کہ لب پہ آئے تبسم سے دوچار
کہتی ہوئی دوڑی کہ مری جانب بچی
بس بات پہ مسکرا رہے تھے سرکار

ہر ہاتھ میں ہے تیغ جگرکاں یا رب
ہر پاؤں میں ہے زنجیر گراں ہے یا رب
مذہب کی بربادی سے دل لرزاں ہیں
انساں کی بربادی کہاں ہے یا رب

نقش قدرت چھپا دے گا دل پہ
سارا عنصر اتار دے گا دل پہ
اس سے اٹھا نہیں تجھے شوق پناہ
پھیلیں گے تو رنگ بار اپنے گا دل پہ

صد شکر کہ یہیں پہ چشم و حیا ہیں
زباں پہ درود اور سرود بھی ہیں
سو ہم بہ زباں ہیں نہ ذرہ بھی نہیں
لاکھوں موجود ہیں نہ زندہ ہیں موجود بھی ہیں

ہر سانس میں قانونِ سزا جاری ہے
ہستی نہیں اک ترس کی بیماری ہے
انساں پہ یہ زندگی ہے اک قہرِ خدا
بیچارے پہ یہ رات بہت بھاری ہے

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں
یہ فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زباں سے میں نکلتا ہے خیال
اپنے میں کائنات کہتا ہوں میں

ہنسنا بھی عجیب ہے رونا بھی عجیب
پانا بھی عجیب طرفہ بات کھونا بھی عجیب
اک قادرِ مطلق کا یہ اوصافِ حسین
ہونا بھی عجیب ہے نہ ہونا بھی عجیب

کیا پھر بھی کھونا ہی پانا ہوگا؟
پھر نازِ جدید دل کا اٹھانا ہوگا؟
سنتے ہیں کہ اے بیخودی رنج سے
پھر حشر کے دن ہوش میں آنا ہوگا!

ناگفتہ ہیں آج تک فسانے لاکھوں
لب بستہ ہے ساز ہیں ترانے لاکھوں
انسان کا دل نہ ہو اگر بندۂ یاس
ہر دم ہیں ابھی فطرت کے خزانے لاکھوں

اک لحظے کا فکر انقلاب پیدا کر لے
کھل جائے کسی پہ کتاب پیدا کر لے
ہو جائیگا صبح عارف ہر ذرّہ کا
چمک جائے کا آفتاب پیدا کر لے

ہاں اگر کوئی حیات سے سمجھا ہو یہ راز
آغاز انجام ہے تو انجام آغاز
دنیا ہے زمانہ جب ابھی کی ہوس
دل سے آتی ہے قہقہوں کی آواز

ایسا نہیں جو منافق انساں کوئی
ہو جس سے نہ بیزار و گریزاں کوئی
انسان ہی ہے در حقیقت ایسا جس سے
یزداں کوئی کہتا ہے تو شیطاں کوئی

پایۂ برتری کا اوج گرشتہ مضمون کیا ہے؟
صیقلِ پیکرِ تہذیب ایشیائی معجون یہ کیا ہے؟
ہر آن بدلنے والے انسان کے لئے
یہ جو نہ بدلنے والا قانون یہ کیا ہے؟

انصاف! ابتری کا چارہ دینے والے
احسان کو بے طمع نگاہ دینے والے
سب بندۂ طمع حشر میں دے گا تعزیر
دل کو یہ سبق گناہ دینے والے

ہر صاحبِ جبر کو جو بے بس کر دے
فطرت کی زباں کیسے زباں تر کر دے
افلاس کو کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کمبخت مسلسل ہو تو کافر کر دے

ہر سانس کو وقفِ صد شکرانہ کر دیں
اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس کو امیروں سے گناہ ہی گناہ
دولت اگر یہ نہ ہو تو قیامت کر دیں

حسن و عشق

جلووں کی ہے بارگاہ میرے دل میں
غلطیدہ ہیں مہر و ماہ میرے دل میں
اس دورِ خودی میں عشق گم ہو جاتا
ملتی نہ اگر پناہ میرے دل میں

یہ سلسلۂ لامتناہی ہے کہ زلف
گہوارۂ بادِ صبح گاہی ہے کہ زلف
اے مستِ شباب دوشِ سیمیں پہ ترے
ڈھلکی ہوئی رات کی سیاہی ہے کہ زلف

ارمان تھے وہ کیا کیا نگار دل میں تیرے
مجروح تھے کس درد سے پہلو تیرے
اب لاؤں کہاں سے میں وہ راتیں افسوس
بہتے تھے مرے سے جب آنسو تیرے

انگارا ترا دہک رہا تھا ظالم
گلنار رخ پہ پیک پڑا تھا ظالم
افسوس وہ عہد شوق جب اک سیس
سینے میں ترے سے دھڑک رہا تھا ظالم

رگ رگ میں لپکتی ہے جو تیری شعلہ اب تک
واللہ کہ تھمے نہیں ہیں آنسو اب تک
اے رشک چمن جو ہم سے بچھڑا کیا تھا
ویران ہے اس دن سے وہ پہلو اب تک

پائندہ ہے اس کیول ہے جو تیرے قرباں
آشفتہ جو اس کیول ہے جو تیرے قرباں
ٹھہرے تو ہے انبیا طے عالم کا مدار
تو اپنی ادا اس کیول ہے جو تیرے قرباں

الفاظ میں غلطیدہ ہے جادو گویا
آواز بدل رہی ہے پہلو گویا
لہجے کا تڑپ ہے درد، عیاذاً باللہ
لفظوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو گویا

آواز میں غلطاں ہیں نگاہیں گویا
گردن میری ہے تیری بانہیں گویا
اس کرب سے اٹھ رہی ہیں نیچی نظریں
آنکھوں سے نکل رہی ہیں آہیں گویا

دل سینۂ نازک میں مچل جاتا ہے
چشمہ تری آنکھوں کا ابل جاتا ہے
اللہ رے سوزِ غم کہ میرے آگے
پھولوں کا ترے رنگ بدل جاتا ہے

آجا، مرتا ہوں غم کے مارے آجا
بھیگی ہوئی رات کے شرارے آجا
اے شام کا وعدہ کرکے جانے والے
اب ڈوب رہے ہیں دیکھ تارے، آجا

ناگن بن کر مجھ کو ڈستا بادل
باراں کی گرسوں پہ برستا بادل
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اس دیس میں پیا ابکی نہ برستا بادل

چونکا ہے کوئی نگار، یا الٰہی توبہ
برسیں ہیں ڈوبا جھاڑ، یا الٰہی توبہ
سکتے ہیں پپیہے بھیرویں کی تانیں لگوایا
ہونٹوں کا خفیف ابھار، یا الٰہی توبہ

نکلی لبِ گلگوں سے جو آہ شعلہ بن کر
سینے میں آئی بسی وہ آیت بن کر
سکتی دل میں پیا کی ان کی تصویر لیے
تصویر ٹپکی ٹکی آنسو بن کر

گردن میں پیا کی پڑی نہ بانہیں تیری
ہونٹوں سے نکل سکیں نہ آہیں تیری
واللہ کہ اب مجھ پہ تبسم ہے حرام
ہنگامِ سفر کے نگاہیں تیری

پھولوں میں چھپی شوخی کا راج دیکھا میں نے
پھر فرقِ حسینوں پہ تاج دیکھا میں نے
پلٹا جو سفر سے گمرہ آل عمر کے بعد
اپنی جانب پھر آج دیکھا میں نے

کھیرے ہے ہوا ہمیں انگلستان و بہار
ہیں دونے والا ہوں اجالا و بہار
فرقت کی ابھی ہیں ابتدائی راتیں
خلوت میں نہ بیٹھے دو یار و بہار

قطروں کی یہ تانیں کہ یہ اک جل کی بہار
قرباں ترے اے نگار پیشرس کی پھوار
اللہ ری کھنکتی ہوئی آواز تری
جیسے یہ ہو جیسے پیشرس کی جھنکار

کیا آج تعارف میں لجایا کوئی
کیا جانیے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
ہم نے جو کہا جو بیشتر سمجھے گئے ہیں
آنکھوں کو جھکائے مسکرایا کوئی

شانوں پہ ہے جھکی ہوئی زلفوں کی لٹک
اعضا میں ہے تازہ شاخِ گل کی سی لچک
اور اس پہ یہ انگڑائی کا عالم کہ نہ پوچھ
بجلی کی ہو بادلوں میں جس طرح دھنک

گفتار میں کھل رہی ہے بیلے کی کلی
رفتار میں پڑ رہی ہے ساون کی ندی
چہرے پہ نمود و ناز آنکھوں میں غرور
سرکار نے کیا آئینہ دیکھا تھا کبھی

بدلی سے ہوا جھلک رہی ہے گویا
یا دل کی کلی چٹک رہی ہے گویا
جنبش میں ہیں یوں صبا سے زلفیں تیری
یا ایک پھوار پڑ رہی ہے گویا

اللہ ری ادا یہ زلف تری مستِ شباب
یا حلقۂ شب رنگ ہے گویا گرداب
یا آتشِ رخ کا ہے یہ دودِ پیچاں
یا نیند سے مست کا الجھا ہوا خواب

پیرانِ ساکوس

ہندو نے اگر علم کا منبر چھوڑا
مسلم نے بھی راستی کا منبر چھوڑا
پنڈت نے اگر بنا دیا بت کو خدا
مُلّا نے خدا کو بت بنا کر چھوڑا

قبروں پہ مریدوں کو جھکاتے رہیے
دھوکے پہ سفینوں کو بچاتے رہیے
اللہ اگر روٹھ رہا ہے روٹھے
کیا اس سے غرض عرس مناتے رہیے

ہم پوچھے کہ معشوقوں کو کیا کہتے ہیں
اتنا ہی کہ بس صلِّ علیٰ کہتے ہیں
لیکن یہ غلام زادۂ ابلیس نژاد
موقع ہو تو ہر بت کو خدا کہتے ہیں

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے
انساں کو بہ طور دغا دیتا ہے
کہہ سکتے نہیں اگرچہ جو حیش - اُن کو
بے روح نمازوں میں لگا دیتا ہے

اے شیخ! ابلیسی نظر ہے طاعت
منعم ہوئے تو اک جبر ہے طاعت
محراب بنا دی گئی انساں کے خطیب!
اعلانِ بزرگیِ بشر ہے طاعت

جنت کے نزول پہ جان دینے والو
گندے سے پانی میں ناؤ کھینے والو
ہر چیز پہ چاہتے ہو استحق جو ہیں
اے اپنے خدا سے سود لینے والو

دنیا ہے کسے شیخ اجمیری کی دید
ہے سینۂ شرک میں بھی قالب توحید
کھل جائے اگر کہ کل ظلمت کی گرہ
ہر جسم سے ہر بن میں ٹپکیں ہزاروں خورشید

پیتیاں شکم ہے عرف بغض سینے والے
حق قسم ہے بست سے کا پینے والے
سے سوکیوں نہ رکھو الے گناہ
حیرات ہے جھمقوں کی جینے والے

عبرت کی نظر سے آسماں کے دیکھو
جاری کی ہیں یہاں کے کارخانے دیکھو
شیطان کی انگلیوں میں گردش کرتے
زہاد کی تسبیح کے دانے دیکھو

اے شیخ اگر کبھی تو رنج اٹھایا ہوتا
اس دل پہ کبھی تو زخم کھایا ہوتا
اس طرح لگا نہ دیا دم ضربیں
بابا دل اگر کہیں لگایا ہوتا

وہ رشتۂ تسبیح ہیں ہم کہ بندھے ہیں
ہم عیب سے وہ پاک ہیں ہم کہ گندے ہیں

دیکھو وہ نکل آئے ہیں مسجد سے شیوخ
گویا وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں

افسوس یہ کچھ پیر دعا دیتے ہیں
کب تیری عقیدت کا صلا دیتے ہیں
منعم! یہ کچھ نہیں لگاتے ہیں گلے
سینے سے تری جیب لگا لیتے ہیں

میکش کا سرور کج کلاہی کا ہے
یا شیخ کا سبب حق نمائی کا ہے
طاعت ہے یہ یا بادہ یادہ زشتی کا خاص
دونوں میں سے کون شے الٰہی کا ہے

زاہد! رہ معرفت دکھاوے ہم کو
پیسے نے کہا کہ نذر دلاوے ہم کو
کافر ہوں جو بیٹی یہ تو فرض اشرفیں
اب اس کا علاج کچھ بتاوے ہم کو

متفرقات

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب
اڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں اک تو مائل بہ زمیں
اور ایک کا رخ ہے آسماں کی جانب

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آئے گی کتنی صدیوں ہے ترانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
ہر دل کو سنائے جا فسانہ اپنا

یہ دبدبہ یہ رواق اللہ اللہ
کسریٰ کا یہ طرفہ طاق اللہ اللہ
سبکیں ترا فریب کھائیں اب جس پہ
دنیا ترا طمطراق اللہ اللہ

باقی نے جھلک اپنی دکھا کر کیا کیا
تاریخ نے کی جلوہ نمائی کیا کیا
نکلا جو لحد سے پیش سلطان کا جاہ
شاعر کی گدائی نے اثر کیا کیا

شیون ہی کی یہیں آگ شباب کا ماتم ہے
یہ عہدِ کامیاب کا ماتم ہے
آنکھوں نے تمام رات اشک برسائے
اور صبح کو آفتاب کا ماتم ہے

قبروں سے اک آہ یہ نکل کر سوئے
اے زندہ دلو نکالو پیش آئے
سمجھے تن پہ کہتا سوتے ہیں
آرام سے ہم زندوں میں روتے

مفلس ہوں اگرچہ وارثِ فطرت ہوں میں
اسرارِ پیمبری کی دولت ہوں میں
اے کج نگہو ادب سے پیش آ
آئندہ زمانے کی امانت ہوں میں

افسردہ ہیں تو لوگ برا مانتے ہیں
ہنستے ہیں تو دوست اجنبی جانتے ہیں
چہروں کی شناخت اہلِ دنیا کو نہیں
چہروں کی قطع پہ آپ پہچانتے ہیں

کیا عمر کے ساتھ جسم ہی ڈھلتا ہے؟
کیوں تیغ کے ساتھ ذہن بھی ڈھلتا ہے؟
جذبات پیچھے وقت پہ عمر سوار
کیوں عمر سے آگے نہ نکلتا ہے؟

اب خواہشِ لذات نہیں ہو سکتی
اب دن کے سوا رات نہیں ہو سکتی
بس لے کے کھڑی رہی ہے دنیا
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

کیا درد کی داد چاہتا ہے کوئی؟
تقدیر کو یا سراہتا ہے کوئی؟
ہر گام پہ پیری ہے خفیف اک آواز
کیا زیرِ قدم کراہتا ہے کوئی؟

کچھ لطفِ شبستاں نہ اٹھایا تھا ابھی
پہلو میں پیشتر ہی سے آیا تھا ابھی
ناگاہ سحر نے آہ بھر کر پوچھا
کس بات پہ چونکیں، مسکرایا تھا ابھی؟

قائم رہے یہ طور، یہ ممکن ہی نہیں
باقی رہے یہ دور، یہ ممکن ہی نہیں
احسان کیا ہے آج جس پر تو نے
کل وہ نہ کرے جور، یہ ممکن ہی نہیں!

سادھوں کی کبھی سے ڈرتا ہوں میں
دوزخ سے نہ نار کی لگی سے ڈرتا ہوں میں
اس ظلم و بیدادری کے باوصف
دنیا! ترے آدمی سے ڈرتا ہوں میں

سمجھاؤں کس الفاظ میں تجھ کو یہ راز
اللہ رے سحر کے وقت کا سوز و گداز
اس طرح چٹکتی ہیں چمن میں کلیاں
اطفال کی ہچکیوں کی جیسے آواز

بیگانۂ ابد سے، نہیں ہوں شاید
ناواقفِ ازل، انتہا نہیں ہوں شاید
یہ طولِ حیات کی تب سب کچھ کہو!
اتنا تو نہیں ہے جتنا نہیں ہوں شاید

رقصاں ہے کہ ہر ایک روش پر سیلابِ حیات
روشن کشتے ہیں گلستاں کے آیات
سرو و سمن و سنبل و نسرین و گلاب
اللہ رے عروسِ نوبہاراں کے کلمات!

جاری ہے گلوں کے درمیاں گفت و شنود
موضوعِ مکالمت ہے انجامِ نمود
کھلتی ہوئی کلیوں پہ ہے شبنم و ضیع
اک موجِ تبسم ہے کہ اشک آلود

قبول اس پہ ہے مرا عشق معانی بھی سہی
خبر اس کی اے انجمن میں ذرہ بھی سہی

حوریں حاضر ہوتی ہیں جب اس کے لئے
اچھا حاضر ہو کر دو یہ تقویٰ بھی سہی

زنجیرِ تحقیق دل پہ کھائے ہوئے آؤ
نورِ مطلق سے لو لگائے ہوئے آؤ

مہر و مہ سے ہمیں بار نہیں دیکھیں کا
شمس و قمر قدم پہ بچھائے ہوئے آؤ

منبعِ طرب سے لطف پیہم لئے
عصیاں کے شب کی چھاؤں میں ہم لئے

آواز دو یا کا شمیم آ ادم لئے
اللہ سے انتقام آدم لئے

بلا دل کا ہوتی عقل سے حماقت ہے یہ
دھوکے کی محبت سے عداوت ہے یہ

شیطان و ابو جہل کی عظمت کی قسم
سو بار عنادی سے بغاوت ہے یہ